جوش ملیح آبادی
کے
خطوط

مرتبہ

خلیق انجم

جوشؔ ملیح آبادی

کے

خطوط

جوش ملیح آبادی
کے
خطوط
مرتبہ
خلیق انجم

سنہ اشاعت : ۱۹۹۸ء

قیمت : (ہندوستان) ڈھائی سو روپے (=/۲۵۰)

(غیر ممالک) دس ڈالر

طباعت : ثمر آفسٹ پرنٹرز، نئی دہلی

**Josh
Ke
Khutoot**

by Khaliq Anjum

1998

Price : India Rs. 250/-

Outside India 10$

تقسیم کار

انجمن ترقی اردو (ہند)

اردو گھر مارگ، راؤز ایونیو،

نئی دہلی ۔ ۱۱۰۰۰۲

فہرست

حرفِ آغاز

جوشؔ ملیح آبادی نے اپنے عزیز دوست ساغرؔ نظامی کو جو خطوط لکھے وہ ساغر صاحب کے پاس محفوظ تھے۔ اُن کی وفات کے بعد ضامن علی خاں نے "ساغر نظامی فن اور شخصیت" کے نام سے ایک کتاب مرتّب کرنے کا پروگرام بنایا۔ اُن کی فرمائش پر میں نے ذکیہ ساغرؔ صاحبہ سے جوشؔ کے خطوط لے کر "جوشؔ بنامِ ساغرؔ" کے نام سے مرتّب کر دیے جنھیں ضامن صاحب نے اپنی کتاب میں شامل کر لیا۔ ۱۹۹۱ء میں یہ خطوط اسی نام سے علاحدہ کتابی صورت میں بھی شائع ہوئے۔

جوشؔ کے پاکستان ہجرت کر جانے سے میرے دل میں اُن کے لیے شدید نفرت پیدا ہو گئی تھی اور پھر جوشؔ کی شخصیت کے بارے میں جو کچھ سُنا تھا اُس نے اس نفرت میں اور بھی اضافہ کر دیا تھا۔ لیکن ساغرؔ کے نام خطوط مرتّب کرنے کے دَوران میں نے سوچا جب مولانا عبد الماجد دریابادی جیسے خدا پرست لوگوں نے جوشؔ کی فنّی عظمت کے پیشِ نظر انھیں معاف کر دیا تو پھر میں کیا ہوں۔

جب ذاتی تعصبات سے بلند ہو کر جوشؔ کی شاعری کا مطالعہ کیا تو اس نتیجے پر پہنچا کہ اقبالؔ کے بعد جوشؔ بیسویں صدی کے دوسرے عظیم شاعر ہیں۔ اپنی غلط رُوی کی تلافی میں نے اس طرح کی کہ ۱۹۹۲ء میں "جوشؔ ملیح آبادی: تنقیدی جائزہ" کے نام سے ایک کتاب مرتّب کی جس میں جوشؔ کی شخصیت اور فن پر اُردو کے ممتاز نقّادوں اور محققوں کے مقالے شامل کیے۔ یہ کتاب انجمن ترقّی اردو (ہند) سے شائع ہوئی۔

"جوشؔ بنام ساغر" کے نام سے میں نے جو کتاب مرتّب کی تھی اس کا مقدمہ اتنا طویل ہو گیا تھا کہ اسے کتاب میں شامل کرنا ممکن نہیں رہا تھا۔ میں نے سوچا کیوں نہ اس مقدمے پر تھوڑی اور محنت کرکے اسے باقاعدہ ایک کتاب کی شکل دے دی جائے۔ چناں چہ "جوشؔ بنامِ ساغر" کے لیے میں نے ایک اور مختصر سا مقدمہ لکھا اور اس نئی کتاب کے لیے "جوشؔ کی شخصیت اور فن" پر مواد جمع کرنا شروع کر دیا۔ اس دوران مجھے خاصی تعداد میں جوشؔ کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ خطوط مل گئے۔ جب میں نے ان خطوط کے بارے میں مشفق خواجہ صاحب کو لکھا تو انھوں نے بڑی تعداد میں مجھے جوشؔ کے اور خطوط فراہم کر دیے۔ اب صورت یہ پیش آئی کہ میں "جوشؔ کی شخصیت اور فن" پر کتاب لکھنے کے کام کو ملتوی کر کے ان خطوط کی ترتیب میں مصروف ہو گیا۔ میرے پاس جوشؔ کے اتنے خطوط جمع ہو گئے ہیں کہ کم سے کم دو جلدوں میں سمائیں گے۔ اس سلسلے کی پہلی جلد اس وقت آپ کے سامنے ہے اور دوسری جلد کے تیار ہو کر شائع ہونے میں ابھی کچھ وقت لگے گا۔

مجھے جوشؔ کے خطوط جن ذرائع سے حاصل ہوئے ہیں اُن کی تفصیل کتاب کے آخر میں مآخذ کے عنوان کے تحت دے دی گئی ہے۔ جوشؔ کبھی خط کے آخر میں تاریخ لکھتے اور کبھی آخر میں۔ اُن کے تاریخ لکھنے کے طریقے بھی مختلف تھے۔ مثلاً:

۲۵ ۴/۴۲ — ۲۵ ۳/۴۳ ، ۲۸-۹-۴۴ — ۲ مئی ۱۹۴۴ء وغیرہ۔

مطبوعہ نسخے میں تمام تاریخیں یکساں انداز میں ہر خط کے آغاز ہی میں درج کر دی گئی ہیں تاکہ پڑھنے والوں کو خطوط تلاش کرنے میں دشواری نہ ہو۔ تاریخ درج کرنے کا انداز مثال کے طور پر یہ ہے۔ ۲۵ اپریل ۱۹۴۲ء

ان خطوط کو جمع کرنے، مرتّب کرنے اور حواشی لکھنے میں جن کرم فرماؤں اور دوستوں نے میری مدد کی ہے ان میں مشفق خواجہ صاحب کا نام سرِ فہرست ہے۔ انھوں نے نہ صرف بہت بڑی تعداد میں جوشؔ کے خطوط ارسال فرمائے بلکہ جوشؔ پر پاکستان میں شائع ہونے والی کتابیں بھیجیں اور حواشی کے سلسلے میں بعض حضرات کے بارے میں

معلومات فراہم کیں۔ بیگم ممتاز مرزا نے شنکر پرشاد کے نام جوشؔ کے خطوط عنایت فرمائے۔ کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ مرحوم اور ساحرؔ ہوشیارپوری مرحوم نے اپنے نام جوشؔ کے خطوط خود ہی مجھ کو دیے۔ میری یہ کچھ عادت سی بن گئی ہے کہ میرے عزیز دوست اسلم پرویز جب تک میرے مسودے کا ایک ایک لفظ نہیں پڑھ لیتے میری تسلّی نہیں ہوتی۔ ان کے مشورے میرے لیے بہت مفید ثابت ہوتے ہیں جن کے بغیر میں اپنی کوئی تحریر شائع نہیں کرتا۔ انھوں نے اس کتاب کے مقدمے پر نظرِ ثانی کر کے اُسے یقیناً بہتر بنایا ہے۔ خدا بخش لائبریری کے ڈائرکٹر جناب حبیب الرحمٰن چغانی اور افتخار امام صاحب نے کچھ جوشؔ کے خطوط اور کچھ مکتوب الیہم کے مختصر سوانحی خاکے ارسال فرمائے۔ ڈاکٹر اخلاق اثر نے جوشؔ کی دو تحریریں عنایت فرمائیں۔ داؤد اشرف صاحب، ڈاکٹر ہلال نقوی، ڈاکٹر کاظم علی خاں، عصمت ملیح آبادی، ایم اے کے فاطمی صاحب، اظہار صہبائی اور ڈاکٹر شفیع احمد شریف نے بیشتر حواشی لکھنے میں تعاون فرمایا۔ دفتر کے میرے ساتھیوں میں عارفہ خانم، اور اختر زماں نے مسودہ تیار کرنے میں میری بہت مدد کی۔ میں ان تمام حضرات کا تہہ دل سے شکرگزار ہوں۔ میری دعا ہے کہ خدا ان سب کو ہمیشہ خوش و خرم اور تادیر سلامت رکھے۔

جوشؔ کو شاعرِ فطرت بھی کہا جاتا ہے اور شاعرِ شباب و شراب بھی اور شاعرِ انقلاب بھی۔ لیکن جوشؔ جس دَور میں اپنے فن کی معراجِ کمال پر تھے وہی ہندوستان میں جدوجہدِ آزادی کے عروج کا زمانہ بھی ہے۔ اس اعتبار سے اگرچہ اُردو انقلابی شاعری کرنے والے تو بے شمار شاعر تھے لیکن شاعرِ انقلاب ایک ہی تھا اور وہ تھے جوشؔ — چناں چہ

کام ہے میرا تغیّر نام ہے میرا شباب
میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب

اور جوشؔ کے اسی طرح کے بے شمار اشعار لاکھوں مجاہدینِ آزادی کے دلوں کو گرماتے اور ان کے اندر انقلابی جوش اور وَلولہ پیدا کرتے تھے۔ جوشؔ نے ایسی نظمیں

قطعے اور اشعار خاصی تعداد میں کہے ہیں جن سے جنگِ آزادی کے سپاہیوں کے دلوں میں دار ورسن کی آزمائشوں سے گزرنے کا عزم اور حوصلہ پیدا ہوا۔ اُن کی بعض انقلابی نظمیں تو ایسی ہیں جن کا مقابلہ شاید اس دور کی ہندوستان کی کسی بھی زبان کی انقلابی شاعری نہ کر سکے۔ "ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے" "تلاشی" "وفادارانِ ازلی کا پیام۔ شہنشاہِ ہندوستان کے نام" "مردِ انقلاب کی آواز" "مقتلِ کانپور" وغیرہ اُن کی ایسی ہی معرکتہ الآرا نظمیں ہیں۔

کئی سال پہلے میں نے اور مشہور مزاح نگار مجتبیٰ حسین نے "ضبط شدہ نظمیں" کے عنوان سے ایک کتاب مرتّب کر کے علی جواد زیدی صاحب کی خدمت میں پیش کی تھی۔ اس کتاب کی ترتیب کے سلسلے میں مجھے نیشنل آرکائیوز میں محفوظ اُردو کی ضبط شدہ منظوم اور نثری تحریروں کے فائل دیکھنے کا موقع ملا۔ ان فائلوں میں جوشؔ کی "ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے" نام کی وہ نظم بھی شامل ہے جسے مجاہدینِ آزادی اور مُحبانِ وطن میں غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی تھی نیشنل آرکائیوز میں محفوظ اس نظم پر کسی سرکاری افسر کا یہ نوٹ درج ہے :۔

> "یہ نظم لاکھوں کی تعداد میں شائع کر کے ہندوستان اور خاص طور سے اُتّر پردیش، بنگال اور پنجاب میں تقسیم کی گئی ہے۔ اس نظم کے سلسلے میں جوشؔ کے گھر کی تلاشی بھی لی گئی تھی۔"

اس تلاشی پر جوشؔ نے ایک معرکتہ الآرا نظم کہی تھی، جس کے دو بند ملاحظہ ہوں :۔

گھر میں درویشوں کے کیا رکھا ہوا ہے بدنہاد
آ، مرے دل کی تلاشی لے کہ بر آئے مُراد
جس کے اندر دشتیں پر ہول طوفانوں کی ہیں
لرزہ افگن آندھیاں تیرہ بیابانوں کی ہیں

جس کے اندر ناگ ہیں، اے دشمنِ ہندوستاں
شیر جس میں ہو نکتے ہیں، کوندتی ہیں بجلیاں
چھوٹتی ہیں جس سے نبضیں، افسر و اورنگ کی
جس میں ہے گونجی ہوئی آواز طبلِ جنگ کی

جوشؔ نے جب مستقل طور پہ پاکستان میں سکونت اختیار کرنے کا اعلان کیا تو ہندوستان اور پاکستان میں اُن کے خلاف ہنگامہ بپا ہو گیا۔ ہندوستان میں جوشؔ کو کچھ عرصہ پہلے ہندوستان کا سب سے بڑا خطاب "پدم بھوشن" ملا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد، پنڈت جواہر لال نہرو اور بعض دوسری اہم شخصیتیں جوشؔ صاحب کا بے انتہا احترام کرتی تھیں، پھر بھی وہ پاکستان چلے گئے۔ اُن کے ہجرت کرنے پر ہندوستانی اِس لیے ناراض تھے کہ اس سے پہلے ہندوستان کے دو بڑے ادیبوں سید سلیمان ندوی اور نیازؔ فتح پوری کو "پدم بھوشن" کے خطاب سے نوازا گیا تھا اور بعد میں یہ دونوں پاکستان ہجرت کر گئے تھے۔ جوشؔ کے جانے کے بعد ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ مسلمانوں کے ساتھ کچھ بھی کرو، اُن کی وفاداریاں پاکستان کے ساتھ ہی رہیں گی۔

اِن حالات میں غیر مسلموں کا یہ سوچنا کسی حد تک بجا تھا۔ اُن کا یہ خیال تھا کہ اگر مسلم لیگ کے رہنما ہندوستان چھوڑ کر پاکستان چلے گئے تو وہ خاص حالات تھے اور ان حالات میں وہی کچھ ہونا تھا جو ہوا۔ لیکن مولانا سید سلیمان ندوی، نیازؔ فتح پوری اور جوشؔ کے حالات مختلف تھے۔ جوشؔ تو ہندوستان میں "آجکل" کے مدیر تھے، آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ تھے۔ ملیح آباد کے باغوں سے اُن کو خاصی آمدنی تھی۔ پنڈت نہرو اور مولانا آزاد سے ذاتی تعلقات کی وجہ سے سرکاری

حلقوں میں ان کا خاصا اثر و رسوخ تھا جس کی وجہ سے وہ بعض لوگوں کا کام کر کے اس کا معاوضہ حاصل کرتے تھے۔ ان سب کے علاوہ جوشؔ کو مشاعروں اور اپنی کتابوں کی رائلٹی سے خاصی آمدنی تھی۔ اس لیے بہت سے ہندوستانی مسلمان بھی جوشؔ کے اس اقدام سے خوش نہیں تھے۔ جوشؔ کے جانے کے بعد ساغرؔ نظامی مرحوم اکثر محفلوں میں اُن کے خلاف گفتگو کرتے تھے۔ ایک دفعہ میں نے ساغرؔ صاحب سے اس کی وجہ پوچھی تو انھوں نے بتایا کہ میں جوشؔ کے خلاف نہیں تھا لیکن مشکل یہ ہو گئی کہ جوشؔ کے پاکستان جانے سے میں اور مجھ جیسے بہت سے مسلم سرکاری مُلازم ہندوؤں کی نظر میں مشتبہ ہو گئے تھے اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ہم سب لوگ زادِ راہ تیار کیے بیٹھے ہیں اور موقع ملتے ہی پاکستان چلے جائیں گے۔ اس لیے پاکستان چلے جانے پر جوشؔ کو بُرا بھلا کہنا ہماری مجبوری تھی۔

اب آئیے پاکستان کی طرف۔ یہ خبر شائع ہوتے ہی کہ جوشؔ نے پاکستان میں سکونت اختیار کر لی۔ پاکستانی ادیب اور صحافی برچھیاں اور بھالے لے کر جوشؔ پر ٹوٹ پڑے۔ مخالفتوں کا جو طوفان بپا ہوا اُس کا حال جوشؔ کی زبانی سُنیے اگرچہ اقتباس طویل ہے۔ لیکن جوشؔ کی زندگی کو سمجھنے کے لیے بہت ضروری ہے۔ جوشؔ لکھتے ہیں کہ:

> "میرے پاکستانی بنتے ہی یعنی جنگل کی چوتھی طرف جاتے ہی ایک قیامت کا غلغلہ برپا ہو گیا۔ پورے پاکستان میں، اور شہر کراچی میں تو اس قدر بلبلا اُٹھا گویا صورِ قیامت پھونک دیا گیا ہے۔ تمام چھوٹے بڑے اُردو اور انگریزی اخباروں کے لشکر خم ٹھونک ٹھونک کر میدانِ جنگ میں آ گئے۔ تمام ادبا و شعرا اور کارٹون سازوں نے اپنے اپنے قلموں کی تلواریں، نیام سے نکال کر، میرے خلاف مضامین، قطعات اور کارٹونوں کی بھرمار کر دی۔
>
> ہر طرف منڈیوں کا سا ایک غلغلہ بلند ہو گیا کہ دُہائی سرکار کی

مغلِ اعظم یعنی ابو طالب نقوی نے جوشؔ کو آدھا پاکستان کاٹ کر دے دیا۔ مختلف ٹولیوں میں بٹے ہوئے لوگ، میرے خلاف متحد ہو کر، شیر و شکر ہو گئے۔ وہابیوں، بریلویوں، دیو بندیوں، قادیانیوں سنّیوں اور شیعوں نے، اپنی چودہ سو برس کی نفرتوں کو یکسر بھلا دیا۔ تبرّا اور مدحِ صحابہ کے مابین طرحِ مصالحت پڑ گئی اور میرے خلاف، متحدہ طور پر اعلانِ جنگ فرما دیا۔

ہیں چمن میں کیا گیا، گویا دبستان کھل گیا

میرا پاکستان آنا، ایسا معلوم ہوا گویا کوئی زبردست ڈاکو قارون کے خزانے پر ٹوٹ پڑا ہے یا ابرہہ نے کعبے کا محاصرہ کر لیا ہے۔ یا کام دیو اچھوتیوں کے محل میں کود پڑا ہے اور تمام کنواری کنیاں، ہائے اللہ ہائے اللہ کے نعرے لگا لگا کر بھاگ رہی ہیں۔ یہ تمام شور، یہ تمام غلغلے، یہ تمام دھماکے اور یہ ساری دُہائیاں جب حکومت کے کان تک پہنچیں تو وزارتِ داخلہ نے نقوی صاحب سے جواب طلب کر لیا۔ اور جس وقت میں نے یہ بات دیکھی کہ مجھے باغ اور سینما کی زمین دے کر نقوی صاحب ایک بڑی مصیبت میں گھر گئے ہیں، تو میں نے چپکے سے باغ اور سینما کے پلاٹ واپس کر دیے۔

اس زمانے میں چودھری محمد علی صاحب وزیرِ اعظم تھے، نقوی صاحب کی اُن سے کھٹ پٹ ہو گئی۔ نقوی صاحب نے، اسکندر مرزا کے بل بوتے پر وزیرِ اعظم سے ٹکّر لی تھی۔ اسکندر مرزا نے اُن کی پُشت پناہی سے روگردانی کی، اور اُن کی کمشنری ختم کر دی گئی۔ نقوی صاحب کے زوال نے میری کمر توڑ دی۔ میں ادھر کا رہا نہ اُدھر کا۔

میں نے سوچا ہندوستان پلٹ جاؤں۔ غیرت نے اجازت نہیں دی۔ میں نے دل سے پوچھا، خاں صاحب، اب کیا ہو گا۔ دل نے

کہا ہمت نہ ہار، اگر خارے بُوَد، گل دستہ گردد۔

لوگوں نے رائے دی کہ میں حکومت سے درآمد برآمد کا لائسنس لے کر کاروبار شروع کردوں۔ مجھ گاؤدی کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ میں تجارت کا اہل نہیں۔ میں نے دوڑنا شروع کر دیا۔ اس دَوڑ دھوپ میں زندگی اجیرن ہو گئی۔ روز صبح کو گھر سے نکلتا، دوپہر کو پلٹتا، تھوڑی دیر آرام کر کے پھر باہر نکل جاتا، اور شام کو واپس آتا تھا۔

میرا عالم اُس گاؤں والوں کے عَلم جیسا ہو گیا تھا جو محرّم کے زمانے میں اُٹھایا جاتا، ڈھول تاشوں کی تڑ تڑ تڑ تڑ، جھَیم جھَیم کی گونج میں ہر مکان کے چبوترے پر رکھا جاتا اور اسی طرح دن بھر چکّر کاٹ کاٹ کر تڑ تڑ تڑ تڑ، جھَیم جھَیم کے ساتھ مکان میں لاکر رکھ دیا جاتا ہے۔ اس دوڑ دھوپ میں خدا کے فضل و کرم سے کچھ ہاتھ تو آیا نہیں، البتہ ڈائرکٹروں سکریٹریوں اور وزیروں کے ایسے دو دو کوڑی کے نخرے، ایسے اوچھے ٹھسّے اور ایسے غیر شریفانہ گڈّا میرِیَن دیکھے کہ آدمی کا وقار نظروں سے گر گیا۔ اور یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ اس قوم میں کسی صاحب قلم کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اور ہر ادیب و شاعر کو چاہیے کہ وہ خود کُشی فرمالے۔ یہ سچ ہے کہ ہندو حُکّام بھی بعض اوقات نخرے دکھلاتے ہیں لیکن اللہ اکبر، یہ مسلمان، جب ہڈ کانسٹبل ہو جاتا ہے، تو ہامان و فرعون بن جایا کرتا ہے اور حکومت کی گدّی پر بیٹھ کر، خدمت گاروں اور پھیری والوں کے لڑکے بھی اپنے آپ کو قیصر و دارا سمجھنے لگتے ہیں۔[1]

میں نے ابھی کچھ دیر پہلے ذکر کیا تھا کہ جوشؔ سے قبل مولانا سلیمان ندوی اور نیاز فتح پوری جیسی معروف ہستیاں پاکستان ہجرت کر گئی تھیں انہوں

[1] جوشؔ ملیح آبادی، یادوں کی برات، دہلی، ۱۹۸۲ء ص ص ۲۸۲ - ۲۸۴

نے وہاں جاکر ایسے کام کی تلاش کی جس کے وہ اہل تھے۔ یعنی علمی اور ادبی کام — اس لیے ان کی مخالفت نہیں ہوئی۔ یہ دونوں کسی پر بوجھ نہیں بنے۔ انھوں نے اپنا کام کیا اور خود آمدنی کے ذرائع پیدا کیے۔ جوشؔ نے علمی اور ادبی خدمات چھوڑ کر ہر چیز کا مطالبہ کیا۔ خود انھوں نے اپنے مطالبات اور کوششوں کی جو فہرست "یادوں کی برات" میں شامل کی ہے وہ اس طرح ہے:۔

۱۔ جہانگیر روڈ کا سینما پلاٹ، اور باغ لگانے کی زمین۔ خود میں نے واپس کر دی۔

۲۔ ایک سوسائٹی کا سینما پلاٹ، نیلام میں میرے نام چھوٹا۔ قیمت ادا نہ کر سکا اس لیے نکل گیا۔

۳۔ کاشتکاری کے لیے، ہاشمی صاحب ڈپٹی کمشنر کراچی نے پچاس ایکڑ زمین دی۔ الطاف گوہر صاحب نے اسے ضبط فرما لیا۔

۴۔ سائیکل رکشاؤں کے پرمٹ ملے۔ نرخ گر گیا، پرمٹ ہوا میں اُڑ گئے۔

۵۔ کولڈ اسٹوریج کی اجازت مل گئی۔ روپیہ لگانے والوں کو ورغلا دیا گیا۔

۶۔ واجد علی شاہ کنٹرول ریٹ پر بسیں دینے پر آمادہ ہو گئے۔ روپیہ لگانے والوں کو روک دیا گیا۔

۷۔ بیڑی کے پتّوں کا لائسنس مل رہا تھا۔ لائسنس دینے والے کے غمزے برداشت نہ کر سکا۔

۸۔ سینما کے سازوسامان کا، دوسرے دن لائسنس مل رہا تھا، وزیر معطّل کر دیا گیا۔

۹۔ ٹیکس ٹائل کا اجازت نامہ ملنے والا تھا، وزیر بدل گیا۔

۱۰۔ پریس قائم کرنے کا اجازت نامہ لکھ کر تیار ہو گیا۔ دستخط کرنے سے پیشتر وزیر کو نکال دیا گیا۔

۱۱۔ مچھلی کی تجارت کا پرمٹ لکھ دیا گیا تھا۔ سکریٹری کو برطرف کر دیا گیا۔
۱۲۔ پٹرول پمپ کی سعی کی، ناکام ہو گئی۔
۱۳۔ ایک مکان الاٹ ہوا تھا آج تک قبضہ نہ مل سکا۔
۱۴۔ دیہی ترقی کے محکمے میں نوکری کی درخواست دی منظور نہیں ہوئی۔
۱۵۔ اپنی کتابوں کی طباعت اور اشاعت چاہی۔ کوئی ناشر تیار نہیں ہوا۔
۱۶۔ فریئر ہال کے ایک گوشے میں ریسٹوران کھلوانے کا وعدہ محکم کیا گیا۔ افسر صاحب کا تبادلہ ہو گیا۔
۱۷۔ سندھی ادبی بورڈ میں ایک علمی کام کیا۔ اُجرت نہیں ملی۔
۱۸۔ محکمہ آبادکاری کے ایک افسر صاحب نے مکان کی زمین الاٹ کر دی۔ چلتے وقت وہ کھڑے نہیں ہوئے۔ الاٹ منٹ کا پرزہ پھاڑ کر اُن کے سامنے پھینک دیا۔
۱۹۔ پنجاب کے چیف منسٹر قزلباش صاحب ایک کارخانے کا پرمٹ دے رہے تھے کہ اُسی دن فوجی انقلاب آ گیا اور اُن کی وزارت نے دم توڑ دیا۔
الغرض :۔

جس جگہ، ہم نے بنایا گھر، سڑک میں آ گیا"[1]

اچھی خاصی آمدنی کے باوجود جوش مالی اعتبار سے پریشان رہتے تھے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اُن کے صاحب زادے سجاد حیدر کے پانچ بچے تھے اور بیٹی کے نو۔ سجاد نا اہل تھے اور بیٹی کے شوہر انفاق بقول جوش نکھٹو تھے۔ کام کرتے تھے لیکن اُن کی آمدنی کبھی اتنی نہیں ہوئی کہ وہ پورے کنبے کی کفالت کر سکتے۔ اور اُن کی اولاد کا خرچ بھی اُٹھانا پڑتا تھا۔ اتنے بڑے کُنبے کے ریڑھ کو قلم کا گھوڑا نہیں کھینچ سکتا تھا۔ اس لیے جوش ایسے وسائل کی تلاش میں رہتے تھے جن سے آمدنی اچھی ہو سکے۔ وہ یہ بھول

---

[1] یادوں کی برات، ص ص ۲۸۴۔ ۲۸۵

جاتے تھے کہ کاروبار اُن کے بس کی بات نہیں تھی۔ وہ اگر پاکستان جاکر اپنے لیے علمی اور ادبی کام ڈھونڈتے تو شاید لوگ انھیں سر آنکھوں پر بٹھاتے۔ چناں چہ جب آگے چل کر انھوں نے ایسا کیا تو انھیں اعلا درجے کی نوکریاں ملیں۔ مگر مشکل یہ تھی کہ ملازمت سے وہ اپنی بیٹی اور بیٹے کے خاندان کا پورا نہیں ڈال سکتے تھے۔ اس لیے انھوں نے حکومتِ پاکستان کے سامنے ایسے بے جا مطالبات رکھے جو ان جیسے بڑے شاعر کو زیب نہیں دیتے تھے۔

جوشؔ نے بہت سے صاحبِ اقتدار لوگوں کے سامنے دستِ سوال دراز کیا تھا لیکن ایک دل چسپ حقیقت یہ ہے کہ زیرِ نظر مجموعے میں بہت کم خطوط ایسے ہیں جن میں جوشؔ نے اپنی ذات کے لیے مالی تعاون کی درخواست کی ہو۔ اس طرح کے دو تین خطوط سر راس مسعود کے نام ہیں۔ سر راس مسعود کا تعلّق بھوپال سے تھا اور یہ وہ ریاست ہے جس نے علامہ اقبالؔ کی سرپرستی کی تھی۔ علّامہ اقبالؔ کا خیال تھا کہ اگر سر راس مسعود سفارش کر دیں تو نواب بھوپال اُن کا بھی کچھ وظیفہ باندھ دیں گے۔ اور یہ وہ زمانہ تھا جب جوشؔ کا حیدر آباد سے اخراج ہو چکا تھا اور آمدنی کے تمام ذرائع مسدود ہو چکے تھے۔[۵]

جب جوشؔ کو اندازہ ہوا کہ ریاست بھوپال سے وظیفہ جاری ہونے کی کوئی اُمید نہیں ہے تو انھوں نے سر راس مسعود کو لکھا:۔

"صرف دَبی زبان سے اس قدر عرض کر دوں کہ آپ میرے ماہ نامے "کلیمِ بلند" کے واسطے از راہِ معارف نوازی بھوپال گورنمنٹ سے مستقل امداد مقرر کرا دیں۔" (مورخہ ۱۰ ؍ دسمبر ۱۹۳۵ء)

دِلّی کے چیف کمشنر شنکر پرشاد کے نام جوشؔ کے خطوط زیرِ نظر مجموعے میں شامل ہیں۔ بیشتر خطوط میں جوشؔ نے اپنے بیٹے سجّاد یا داماد التفات کے لیے کچھ نہ کچھ مطالبہ

---

۵ دیکھیے جوشؔ کا خط بنام سر راس مسعود مورخہ ۴ ؍ مارچ ۱۹۳۵ء

کیا ہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں :-

" لیجیے حاضر ہیں یہ میرے بھانجے اور داماد التفات۔ عرض کر چکا ہوں کہ یہ دہلی کالج میں تین سو روپے پاتے ہیں۔ نو بچے، ایک بیوی، ایک خود اور کم سے کم ایک نوکر۔ سب ملا کر ایک درجن آدمیوں کو دیکھیے اور تین سو روپلّیوں پر نگاہ کیجیے اور پھر اس زمانے کی گرانی پر نگاہ ڈالیے۔ التفات معمولی گریجویٹ نہیں۔ واقعی پڑھا لکھا آدمی ہے۔ ایمان دار، وفادار اور محنتی اور سمجھ بوجھ رکھنے والا ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہ اپنے فرائض اس قدر غیر معمولی قابلیت سے انجام دے گا کہ آپ کو دل ہی دل میں یہ کہنا پڑے گا کہ جوش مردود نے میرے گلے میں کیسا بندر باندھ دیا ہے۔ دہلی کالج کے تمام اُستادوں کو فوجی تربیت دیے جانے کا فتنہ بہت جلد برپا ہونے والا ہے اور چوں کہ اس سلسلے میں آدمی پر آدمی چڑھا کر دوڑا جاتا اور ماں کی گالی دی جاتی ہے۔ اس لیے التفات مستعفی ہو جائے گا جس کے معنی یہ ہوں گے کہ یہ تین سو ماہانہ کی رقم بھی بند ہو جائے گی۔ بندہ پرور جس قدر جلد اسے روزگار سے لگا کر میرے سر کا سب سے بڑا بوجھ اُتار دیجیے۔ ورنہ اس خاکسار کا انتقال ہو جائے گا اور آپ ہائے کر کے رہ جائیں گے۔ اور پھر پچھتانے اور ہوش میں آنے سے کوئی فائدہ نہ ہو گا۔"

(مورخہ ۲۶ رجون ۱۹۵۴ء)

حالت یہ تھی کہ شنکر پرشاد ایک مطالبہ پورا کرتے تھے اور جوش دوسرا مطالبہ پیش کر دیتے تھے۔ مثلاً جوش نے اپنے بیٹے سجاد حیدر کے لیے شنکر پرشاد سے درخواست کی کہ وہ ایک ٹرک کا پرمٹ دلوا دیں۔ ٹرک کے لائسنس کی منظوری آگئی اور ابھی لائسنس ملنے میں ایک دو دن باقی

تھے کہ جوشؔ نے ان الفاظ میں دو اور پرمٹوں کا مطالبہ کر دیا:-

"ایک ٹرک کا پرمٹ کل پرسوں تک مل جائے گا۔ لیکن اب آپ سے پردہ کاہے کا، ایک پرمٹ سے کام ہرگز نہیں چلے گا۔ کیوں کہ روپیہ نہ ہونے کے باعث ایک صاحب کو ٹرک میں شریک کیے بغیر کام چل نہیں سکتا، اور ظاہر ہے کہ شرکت میں آمدنی بٹ جائے گی۔ اس لیے آپ جیسا کہ درخواستوں میں درج ہے۔ دو پرمٹ اور دلا دیں، تاکہ مجموعی آمدنی اتنی ہو جائے کہ میرے بیٹے اور بیٹی دونوں زندگی بسر کر سکیں یا پھر ایک بس کا پرمٹ عطا فرما دیا جائے۔ غرض کہ آپ جینے کی کوئی نہ کوئی سبیل نکال دیں (مورخہ ۲۷ جولائی ۱۹۵۶ء)

جملۂ معترضہ کے طور پر یہاں ایک بات عرض کر دوں۔ جوشؔ نے اپنے خطوں میں شنکر پرشاد کی تعریف خوشامد کی حد تک کی ہے۔ شنکر پرشاد انتہائی مہذب اور شریف النفس انسان تھے۔ انھوں نے جوشؔ کے بہت سے مسائل حل کیے۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ "یادوں کی برات" میں جوشؔ نے اپنے اس محسن کا ذکر تک نہیں کیا۔ جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا کہ جوشؔ، شنکر پرشاد کے نام خطوط میں بار بار اپنے اور دا اماد کے لیے کسی نہ کسی چیز کا مطالبہ کرتے ہیں، اپنے لیے کبھی کچھ نہیں مانگا۔ ابو طالب نقوی نے جوشؔ کو رہائشی کوٹھی اور سینما کے پلاٹوں کا جو سبز باغ دکھایا تھا وہ ہی انھیں پاکستان کھینچ لایا تھا۔ لوگ یہ بھی جانتے تھے کہ مرتے دم تک جوشؔ کی ذہنی وابستگی ہندوستان کے ساتھ رہی۔ وہ ہندوستان کے لوگوں اور رہنماؤں کے مداح رہے۔ پاکستان اور اس کے رہنماؤں پر لعن طعن کرتے رہے۔ یہ باتیں ایسی تھیں جو پاکستانیوں کو بہت ناگوار گذرتی تھیں۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ اس معاملے میں پاکستانیوں کا رویہ غلط نہیں تھا۔ جمہوریت کی خوبیوں اور خرابیوں کی بحث سے قطع نظر یہ بات تسلیم کرنی ہی پڑے گی کہ ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جہاں ہر شخص کو بڑی حد تک اظہارِ خیال کی آزادی حاصل ہے۔ چناں چہ اس معاملے میں

یہاں اہم ترین شخصیات کو بھی نہیں بخشا جاتا۔ ایسا شاید ہندوستان میں ہی ممکن ہو سکتا ہے کہ ۱۵ اگست کو وزیرِ اعظم اندرا گاندھی لال قلعے سے یومِ آزادی کے جلسے کو خطاب کر رہی ہیں اور اس سے کچھ ہی فاصلے پر امام جامع مسجد عبداللہ بخاری صاحب دُور دُور تک لاؤڈ اسپیکر لگا کر وزیرِ اعظم کی باتوں کا نہ صرف جواب دے رہے ہیں بلکہ ساتھ ساتھ یہ اعلان کر رہے ہیں کہ اندرا گاندھی کون کون سی بات غلط کہہ رہی ہیں۔ آپ چاہیں تو وزیرِ اعظم پر تنقید کیجیے، چاہیں قوم کو بُرا بھلا کہیے۔ چاہیں تو اربابِ اقتدار پر تبرّا بھیجیے۔ آپ آزاد ہیں۔ اس کے برعکس پاکستان ایک ایسا ملک تھا جو نیا نیا وجود میں آیا تھا۔ پاکستان کے شہری نفسیاتی طور پر اپنی شناخت قائم کرنے کے عمل میں مصروف اور اپنے واضح تشخص کی تلاش میں محو تھے۔ ایک ایسی شناخت اور ایک ایسا تشخص جو ہندوستان کے مقابلے میں نشانِ امتیاز بن سکے۔ ہندوستان آزاد ہونے کے بعد ہندوستان ہی رہا، اس لیے ہندوستانیوں کے لیے یہ آزادی ہیجان انگیز تھی۔ یہ ہیجان انگیزی آگے چل کر جمہوریت کی بدولت ہمارا قومی مزاج بن گئی۔ ایک نئے ملک کی حیثیت سے پاکستان کا وجود میں آنا بھی اتنا ہی ہیجان انگیز تھا، لیکن جلد ہی ایک نئی قوم اور نئے ملک کا وجود اور اس کی حیثیت متعین کرنے کی نفسیاتی اور ثقافتی ضرورت اس ہیجان پر حاوی ہو گئی۔

ایسا نہیں ہے کہ پاکستان کے لوگ اپنے ملک یا اس کے رہنماؤں پر تنقید نہیں کرتے، لیکن تنقید کرتے ہوئے ان کے لب و لہجے میں وہ شدت نہیں ہوتی تھی جو جوشؔ کے لب و لہجے میں تھی۔ پھر جوشؔ کا ایک خاص پس منظر تھا۔ ان کے بارے میں سب جانتے تھے کہ وہ پاکستان صرف دولت حاصل کرنے کے لیے آئے تھے۔ اگست ۱۹۶۷ء میں ہندوستان سے محبت کرنے کی وجہ سے جوشؔ پاکستان کی حکومت اور عوام دونوں کے معتوب ہو گئے اور انھیں اس کی زبردست سزا ملی۔ جوشؔ نے یہ واقعہ خاصی تفصیل کے ساتھ "یادوں کی برات" میں لکھا ہے۔

ہوا یہ کہ اس سے پہلے بھی وہ ہندوستان آئے تھے لیکن اس دفعہ انھیں ملیح آباد

میں اپنے باغوں کے تصفیے کے سلسلے میں چار مہینے لگ گئے۔ مشاعرے کے سلسلے میں وہ بمبئی گئے۔ جہاں ظ انصاری مرحوم نے ان کا انٹرویو لیا اور وہ انٹرویو انگلش کے کسی اخبار میں شائع ہوا۔ جوشؔ کے ہمراہ ایک صاحب عرش ٹونکی آئے تھے جو جوشؔ کے ساتھ سائے کی طرح لگے رہتے تھے۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ حکومتِ پاکستان نے جاسوسی کے لیے انھیں جوشؔ کے ساتھ بھیجا تھا اور وہ مستقل جوشؔ ہی کے ساتھ رہتے تھے۔ انھوں نے پاکستان جاکر جوشؔ کے خلاف زہر اُگلا، اور حکومتِ پاکستان کے کچھ افسروں کی حمایت حاصل کرنے کے لیے جوشؔ سے کچھ ایسی باتیں منسوب کیں جو صریحاً غلط تھیں۔ انھوں نے کہا کہ جوشؔ نے ہندوستان کی بہت تعریفیں کیں، لیکن پاکستان اور اس کے رہنماؤں کو بہت بُرا بھلا کہا۔ اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ نے لکھا ہے کہ:۔

> "جہاں تک مجھے علم ہے جوشؔ کے خلاف جو شکایتیں درج کی گئی تھیں ان میں سے ایک تو یہ تھی کہ انھوں نے بمبئی میں ایک اخباری انٹرویو میں پاکستان کے خلاف زہر اُگلا۔ اتفاق سے میں بھی اس وقت موجود تھا اور یہ انٹرویو ظ انصاری نے سید وبھائی کے گھر لیا تھا۔ اس سارے انٹرویو کے دوران میں جوشؔ صاحب نے ہندوستان سے محبت کا تو ضرور اظہار کیا۔ لیکن پاکستان اور پاکستان کی حکومت کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں کہا۔" [1]

اس زبردست سازش کا نتیجہ یہ ہوا کہ پاکستان کے ترقی اُردو بورڈ سے جوشؔ کی ملازمت ختم کردی گئی اور جوشؔ کے بقول اُن کا پاسپورٹ ضبط کرلیا گیا۔ ان کے پاس سیمنٹ کی ایک ایجنسی تھی اسے ختم کردیا گیا۔ جوشؔ کے باغوں کا جو روپیہ ریزرو بنک میں تھا، اس کی اَدائیگی روک دی گئی۔[2]

---

[1] یادوں کا جشن، ۲۵۵

[2] یادوں کی برات، ص ۲۹۳

اس پیمانے پر جوشؔ کی مخالفت کی وجہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان پھیلی ہوئی نفرت تھی۔ پاکستان کے کچھ لوگ یہ ہرگز گوارا نہیں کرتے تھے کہ جوش ہندوستان اور یہاں کے لوگوں کی تعریف کریں۔

جوشؔ نے پاکستان ریڈیو کو اس شرط پر ایک انٹرویو دیا کہ وہ ان کے مرنے کے بعد نشر ہوگا۔ انٹرویو میں جوشؔ نے ہندوستان دوستی کا اظہار کیا تھا اور پاکستان اور اس کے رہنماؤں پر کڑی تنقید کی تھی۔ جوشؔ دشمنی میں وہ انٹرویو اُن کی زندگی ہی میں نشر کر دیا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پاکستانی محبِ وطن برچھیاں اور بھالے لے کر جوشؔ پر دوڑ پڑے۔

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ ہندوستان کے لوگ بھی جوشؔ سے زیادہ خوش نہیں تھے۔ ان کے پاکستان جانے پر یہاں بہت سے چھوٹے بڑے ادیبوں نے ان کے خلاف زہر اُگلا اور کافی دن تک ہندوستان کے اخباروں میں ان کے خلاف مضامین چھپتے رہے۔ اس لیے ہندوستان میں جوشؔ کے چاہنے والوں کی تعداد بس برائے نام ہی تھی۔ مذہب کی جانب جوشؔ کے رویّے اور اُس کے برملا اظہار نے بھی اُن کے مخالفوں کی تعداد میں خاصا اضافہ کیا۔

مذہب کے معاملے میں جوشؔ خاصے آزاد خیال تھے۔ اس پر طرّہ یہ کہ اس آزاد خیالی کا تحریر اور تقریر دونوں میں بے باکانہ اظہار کرتے تھے۔ ان کی یہ ادا مذہب سے والہانہ عقیدت رکھنے والوں کو ایک آن نہ بھائی۔ اس معاملے میں جوشؔ نے خاصی بڑی تعداد میں مخالفین پیدا کر لیے۔ اگرچہ وہ شاعری کے تعلق سے مذہبی مسلک میں

باخدا دیوانہ باش با محمد ہوشیار

کے قائل نظر آتے ہیں۔ اس بات کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ جوشؔ نے آں حضرتؐ، آلِ رسولؐ اور ایسی ہی قابلِ احترام ہستیوں کے بارے میں کبھی گستاخانہ الفاظ استعمال نہیں کیے بلکہ ہمیشہ بہت ادب اور احترام سے ان کا نام لیا۔ حضرت امام

حسین کے انھوں نے بہت سے مرثیے بھی لکھے۔ بعض مرثیے تو انھوں نے جوانی کے زمانے میں لکھے تھے اور پھر آخری عمر میں تو بڑی تعداد میں لکھے۔ البتہ خدا کے بارے میں جوشؔ ایسی باتیں کرتے تھے جو انھیں نہیں کرنی چاہیے تھیں۔ اکثر مشاعروں میں ایسے اشعار پڑھ دیا کرتے تھے جن میں خدا کے وجود کے بارے میں تشکیک کا بر ملا اظہار ہوتا اور راسخ العقیدہ مسلمانوں کو یہ اشعار سن کر محسوس ہوتا تھا جیسے جوشؔ خدا کا مذاق اُڑا رہے ہیں۔

میرا ذاتی خیال ہے کہ جوشؔ کا مذہب کے بارے میں جو بھی رویہ رہا ہو، لیکن شاید وہ دہریے بالکل نہیں تھے۔ ایسا میں جوشؔ کے بارے میں اپنے ایک ذاتی تجربے کی بنا پر کہہ رہا ہوں :

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں دہلی یونیورسٹی کے کروڑی مل کالج میں اُردو کا اُستاد تھا۔ جوشؔ پاکستان جانے کے بعد پہلی مرتبہ ہندوستان آئے تھے۔ ادبی محفلوں اور جلسوں میں ان کے آنے کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ ان دنوں ڈاکٹر سروپ سنگھ (سابق گورنر گجرات) کالج کے پرنسپل تھے۔ میں نے ان سے مشورہ کرکے کالج کی "بزمِ ادب" کی جانب سے جوشؔ کو مدعو کیا۔ جوشؔ کی شان میں کالج ہال میں شان دار جلسہ ہوا ۔ لوگوں نے جی بھر کر ان کا کلام سُنا۔ جلسے کے بعد پرنسپل کے آفس میں چائے کی میز پر جوشؔ کے ساتھ غیر رسمی بات چیت کا سلسلہ شروع ہوا۔ میں نے موقع کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے خدا کے بارے میں ان کے عقیدے پر براہِ راست اُن سے سوال کر ڈالا۔ جوشؔ نے کہا کہ

> "بھئی ! میں اس بات کو جانتا ہوں کہ یہ تمام نظامِ کائنات کسی طاقت کے بل پر چل رہا ہے، خود کار نہیں ہے۔ آپ اس طاقت کو جو چاہے نام دے لیجیے، خدا کہہ لیجیے، انرجی کہہ لیجیے یا کچھ اور۔"

بہر حال خدا کے بارے میں جوشؔ کے اس آزادانہ رویّے نے اُن کے مخالفوں میں غیر معمولی اضافہ کیا۔ ہندوستان کے لوگ تو اس رویّے کو پھر بھی برداشت کر سکتے

تھے، لیکن پاکستان جیسے ملک میں اس کے لیے کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اس کے علاوہ جوشؔ کے منہ میں جو کچھ آتا تھا، کہہ دیا کرتے تھے۔ اگرچہ جوشؔ کے مذہبی عقائد پر خورشید علی خاں صاحب نے "ہمارے جوشؔ صاحب" میں مدلّل بحث کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ جوشؔ دہریے اور ملحد نہیں تھے۔

اس کے علاوہ پاکستان میں جوشؔ ملیح آبادی کے خلاف شیعہ سُنّی اختلافات اور علاقائی عصبیت کا بھی دخل تھا۔ اس طرح جوشؔ نے خود ہی اپنے لیے جوشؔ فراموشی کے ایسے اسباب جمع کر دیے جن کی بدولت برصغیر کے اس عظیم شاعر کا سوسالہ یومِ ولادت ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں خاموشی سے گزر گیا۔ یہاں تک کہ جوشؔ کے مخالفین کی جانب سے بھی جوشؔ ملیح آبادی کے نام پر ایسا بھی کوئی شور و غوغا بلند نہیں ہوا جس میں یہ کہا جاتا کہ "خبردار جو کسی نے جوشؔ کے صد سالہ جشنِ ولادت کا نام لیا۔"

جوشؔ سماج کے ایک فرد بھی تھے اور اُردو کے ایک عظیم شاعر اور ادیب بھی۔ فرد کو اس کے اعمال کی پاداش میں سُولی پر بھی لٹکا سکتے ہیں اور اگر وہ فرد ادیب یا شاعر ہو تو کچھ عرصے کے لیے ادبی مورخ اور نقّاد پر بھی یہ حکم نافذ کیا جا سکتا ہے کہ وہ اس کے بارے میں کچھ نہ کہیں لیکن ایک تاریخی حقیقت یہ بھی ہے کہ زیادہ تر دفینوں کا مقدر ان کا دوبارہ دریافت ہونا ہوتا ہے۔ اس لیے مستقبل کے نقّاد کو جوشؔ کے ادبی محاسبے سے کون روکے گا؟ شاید کوئی نہیں۔

جوشؔ کے مخالفین سے میری دست بستہ گذارش ہے کہ وہ جوشؔ سے کسی بھی وجہ سے ناراض ہوں، اب انھیں معاف کر دیں۔ اگر عبدالماجد دریابادی جیسے خدا پرست، سید بابا ذہین شاہ تاجی جیسے بلند مرتبہ صوفی اور میاں محمد صادق جیسے پابندِ صوم و صلوٰۃ جوشؔ کی فنی عظمت کے پیشِ نظر انھیں معاف کر سکتے ہیں تو ہم پھر کس گنتی میں ہیں۔ اگر یہ ممکن نہیں تو کم سے کم ہم جوشؔ کی شخصیت اور فنی عظمت کو ایک دُوسرے سے الگ کر کے دیکھیں، یہ جوشؔ کے نہیں، اُردو ادب اور خود ہمارے

حق میں ہوگا۔

اگر جوشؔ شاعر نہ ہوتے اور صرف نثر لکھتے تب بھی اُردو کے صفِ اوّل کے نثر نگاروں اور انشا پردازوں میں اُن کا شمار ہوتا ہے۔ اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ جوشؔ کو زبان پر جو قدرت حاصل تھی وہ میر انیسؔ کے بعد صحیح معنوں میں جوشؔ ہی کو نصیب ہوئی تھی۔ زبان و بیان پر جوشؔ کی یہ قدرت شاعری ہی میں نہیں نثر میں بھی اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔ اُن کے نثری اسلوب میں شاعرانہ رنگینی ہے اور اس پر تغزّل کا رنگ غالب ہے۔ اُن کی بعض تحریروں اور خاص طور سے مکاتیب کے بعض حصے ادبِ لطیف یا نثری نظموں کے نمونے معلوم ہوتے ہیں۔ جوشؔ کا اسلوب بہت توانا اور منفرد ہے۔ اور انتہائی فطری نثر لکھتے ہیں، جو تصنّع اور بناوٹ سے پاک ہے۔ مکتوبات میں جوشؔ کا اندازِ نگارش نہایت سنجیدہ اور کہیں کہیں بے حد شگفتہ ہے۔ بعض عبارتیں طنز و مزاح کا بھی اعلا نمونہ ہیں۔ منظومات میں چوں کہ متنوع موضوعات و مسائل ہوتے ہیں اس لیے اسلوبِ نگارش بھی طرح طرح کے رنگ بدلتا رہتا ہے۔ جہاں جوشؔ کے مکتوبات میں کہیں کہیں فکر کی گہرائی اور فلسفیانہ موشگافیاں ہیں تو کہیں بالکل ہی عامیانہ اندازِ گفتگو ہے۔ کہیں مذہبی مباحث ہیں اور کہیں فحش گفتگو اور نرا کھلنڈرا پن، لیکن اس کھلنڈرے پن میں بھی دل کو لبھانے والے دھنک کے سے کتنے ہی رنگ ہیں۔

جوشؔ کے خطوط کی بعض عبارتیں انشا پردازی کا بہترین نمونہ ہیں۔ ایک خط میں جوشؔ ساغرؔ کو لکھنؤ آنے کی دعوت کس خوب صورت انداز میں دیتے ہیں:

"میری زندگی کا پیمانہ ہولناک سرعت کے ساتھ بھرتا چلا جارہا ہے آیئے
اور چھلک جانے سے بیشتر آیئے، ورنہ

پس از آں کہ من نہ مانم بچہ کار خواہی آمد

(بنام ساغرؔ۔ ۹ نومبر ۱۹۴۰ء)

خورشید علی خاں کے نام ۱۲ جولائی ۱۹۷۵ء کے ایک خط میں حسین اور کربلا کے استعاروں کا کیسا برجستہ استعمال کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:-

"ہَوا میں خنکی تیر رہی ہے اور میرے دل میں اَلاؤ جل رہا ہے اُلاؤ۔ سنّاٹا، فضا کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور میرے سینے میں قیامت کا شور برپا ہے اور اس قدر کہ کان پڑی آواز سُنائی نہیں دے رہی ہے۔ کروڑوں ایٹم بم پھٹ رہے ہیں اور تمام گلی کے کتّے بھونک رہے ہیں مجھ پر۔ میں حُسین ہوں اور تمام کرۂ ارض کربلا ہے۔"

جوشؔ اپنے مفہوم کی ادائیگی کے لیے بعض اوقات بہت دل کش اندازِ بیان اختیار کرتے ہیں۔ ساغؔر صاحب کو لکھنا چاہتے ہیں کہ خدا کرے تم صحت یاب ہوگئے ہو۔ اس مضمون کو کیسے دلچسپ اور برجستہ انداز میں بیان کرتے ہوئے ساغؔر کو لکھتے ہیں۔

"خدا کرے اب آپ چوکڑیاں بھر رہے ہوں۔"

(مورخہ ۱۶۔اکتوبر ۱۹۳۵ء)

"ایک اور خط میں ساغؔر کو لکھتے ہیں :۔

"میاں صاحبزادے، بس اب اچھے ہو جاؤ، تمھاری بیماری سے دِل کُڑھتا ہے۔"

(مورخہ ۲۔دسمبر ۱۹۳۵ء)

جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا جوشؔ کے خطوط کے بعض حصّے ایسے ہیں، جو انشا پردازی کے بہترین نمونے ہیں۔ دیکھیے بابا ذہین شاہ تاجی کے نام ایک خط میں فلسفیانہ گفتگو کرتے ہیں لیکن اس گفتگو کے اظہار کے لیے کیسی دل کش انشا پردازی کا سہارا لیتے ہیں۔ لکھتے ہیں :۔

"بابا صاحب۔ حقائق بے نہایت تلخ ہیں۔ کون ان سے منھ موڑ سکتا ہے ۔۔ اقوال و اساطیر سے ہم تا بہ کے فریب کھائیں اور تا چند اوہامِ آبائی کے سامنے سر جھکائیں۔ قبلہ و کعبہ آپ بڑے مزے میں ہیں۔ رومیؔ و غزالیؔ آپ کے سامنے بانسری بجا رہے ہیں۔ تخیلات اور تاویلات کی وجدانی دیواریں آپ کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ آپ لے ذوالاحترام

پھولوں کی چادر، آپ کے سر پر تانے ہوئے ہیں اور اولیاے کرام، آپ کو لوریاں دے رہے ہیں اور اس بنا پر آپ اس دوزخِ زندگی میں بیٹھے، جنت کی ہوائیں کھا رہے ہیں۔ لیکن میں نامُراد منطق کے تپتے سُورج اور دلائل کے چمکتے نیزوں کے سامنے، سینہ عریاں کیے کھڑا ہوں۔ مجھ سے ہاں مجھ سے پوچھیے کہ یہ کارخانۂ عالم کیا ہے، اور اس کارخانے کا جنرل منیجر کیا ہے۔

ایں میرسید کہ بر غالبِ ناکام، چہ رفت
می تواں گفت کہ ایں بندہ، خداوند نداشت"

(مورخہ ۲۲ جولائی ۱۹۷۲ء)

یہ دلچسپ اندازِ بیان بھی ملاحظہ ہو:۔
" میاں صاحب، پَر دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک تو طائروں کے، جن سے وہ پرواز کرتے ہیں اور دوسرے پَر امرا کے ہوتے ہیں۔ سونے، چاندی کے، جن کی مدد سے وہ اُڑا کرتے ہیں۔ میں دونوں پروں سے محروم ہوں۔ کیوں کہ نہ تو طائر ہوں نہ امیر اور اس لیے آپ تک اُڑ کر نہیں آسکتا۔" (بنام محمد صادق۔ ۹ نومبر ۱۹۴۰ء)

آخری عمر کے عشق کے بارے میں ایک خط کا اقتباس ملاحظہ ہو:
"مجھ کو اپنی ذات سے بڑی شرم آتی ہے، سر پر بارِ ماہ و سال اور پاؤں میں زنجیرِ جمال۔ ہر چند میں نے اس زنجیر سے بہت ابا، کیا، حیدر آباد دکن کی زبان میں بھڑیاں (فریاد کی آوازیں) ماریں کہ میں یہ زنجیر نہیں پہنوں گا، ہرگز نہیں پہنوں گا، مگر ایک دستِ حنائی نے، زور لگا کر، یہ زنجیر پہنا ہی دی اور میں اپنی عقل کو منھ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔" (بنام راغب مراد آبادی، ۲۲ جون ۱۹۷۳ء)

جوشؔ کو ہر طرح کی نثر پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ اگر ایک طرف وہ انتہائی سنجیدہ نثر لکھ سکتے تھے تو دوسری طرف اعلا درجے کی مزاحیہ نثر لکھنے پر بھی اتنے ہی قادر تھے

وہ جمیل مظہری کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں :-

"سنیے مظہری صاحب، میرے خون میں آفریدی پٹھان ہے۔ اس کا تو یہ فرمان ہے کہ بائی (بھائی) اس آدمی (مظہری) کے خط کا جواب ہرگز نہ دے۔ یہ تیرے خطوط کا جواب نہیں دیتا۔ بہوت خراب آدمی ہے۔ یہ ڈبلا والا "بد" خبردار خان صاحب "بد" کے بعد "معاش" ہرگز نہ کہنا۔ اچا بھائی" لیکن بڑی مشکل تو یہ ہے کہ طبعاً میں سید واقع ہوا ہوں اور میرے قلب سیادت میں آپ کا وہ ہے جسے فاسقوں، شعراء وصوفیا کی زبان میں عشق کہا جاتا ہے اور چوں کہ ہر سالا عشق پرلے درجے کا بے حیا و بے غیرت بلکہ "لو شب وصل غیر بھی کاٹی" قسم کا نفرا ہوتا ہے اس لیے :-

میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

کا ارتکاب کرتا رہتا ہے اور اسی بنا پر میرے خطوں کے جوابات ہضم کرنے والے علّامہ صاحب آپ کا یہ نسلاً پٹھان اور طبعاً سید عاشق آپ کے خط کا جواب دے اور شب غیر کاٹ رہا ہے۔ اخ تھو عاشق سالے پر۔

(مورخہ ۲۷ اپریل ۱۹۵۱ء)

جوشؔ کبھی کبھی دل چسپ واقعات یا لطیفے بیان کر کے خط کو دل چسپ بنا دیتے ہیں۔ جوشؔ نے ذہین شاہ بابا کے نام ۲۲۔جولائی ۱۹۷۲ء کو ایک خط لکھا۔ چوں کہ جوشؔ کے پاس لکھنے کے لیے کوئی خاص بات نہیں تھی اس لیے انھوں نے ایک لطیفہ نما واقعہ بیان کر کے خط پورا کر دیا۔ یہ لطیفہ بیان کر چکنے کے بعد انھوں نے جو آخری دو تین فقرے لکھے وہ بہت معنی خیز ہیں اور جوشؔ کے مزاج کی غمازی کرتے ہیں :-

"کہتے ہیں کسی بادشاہ کے ملک پر اس کے حریف نے چڑھائی کی بادشاہ نے دوسری پلٹنوں کے ساتھ ساتھ لانبے تڑانگے ہجڑوں کی بھی ایک پلٹن بنائی اور اس کو میدانِ جنگ میں بھیج دیا۔ دشمن

کی فوج اُن ہیجڑوں کا قد و قامت دیکھ کر ہراساں ہو گئی۔ سالارِ فوج نے جب یہ سماں دیکھا تو اپنے سپاہیوں کا دل بڑھانے کے لیے اس نے گرجتی آواز میں نعرہ لگایا کہ اے بہادر و ٹکڑا دے اُڑا کر رکھ دو ان ہیجڑوں کے۔ (دشمن کے سپاہ سالار کو یہ مطلق پتا نہیں تھا کہ وہ دراصل ہیجڑے ہیں۔ اس نے تو یہ لفظ "بزدلوں" کے معنی میں استعمال کیا۔)

ہیجڑوں نے جیسے ہی یہ نعرہ سُنا تلواریں پھینک دیں، پلّو سر پر ڈال لیے اور تالیاں بجا بجا کر ناچنے گانے لگے۔ "قُربان جاؤں پہچان لیا، قُربان جاؤں پہچان لیا۔ قُربان جاؤں پہچان لیا۔ اسی طرح تفکّر کی زمین پہ کھڑے ہو کر جب میں نگاہِ بغاوت اُٹھاتا اور چلاتا ہوں کہ یہ سب کچھ دھوکا ہے تو آسمان سے آواز آنے لگتی ہے۔ "قربان جاؤں، پہچان لیا۔" "قربان جاؤں، پہچان لیا۔" "قربان جاؤں، پہچان لیا!" تاتا تھیا، تاتا تھیا، مان لیا، "قربان جاؤں، پہچان لیا۔"

عورتوں کی زبان

جوش اظہارِ خیال کے لیے کبھی کبھی عورتوں کی زبان کا استعمال بھی کرتے ہیں جس سے اُن کا اسلوب کچھ مضحکہ خیز ہو جاتا ہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

"خدا مارے اس سردی کو، اجی قلم ہی قابو میں نہیں آ رہا۔ انگلیاں باجی پن کی رگ کی طرح اینٹھی جا رہی ہیں۔"

(بنام ساغر۔ ۲۲۔ مارچ ۱۹۳۷ء)

"خدا مارے" سے اظہارِ بیان کا تاثر کم ہو گیا ہے۔ اس خط میں جوش لکھتے ہیں :۔

"اُف کیسی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی ہیں۔ دم نکلا جاتا ہے دم، شام ہوتی

تو اس بدمعاش سردی سے بذریعہ آتشِ سیال انتقام لے لیتا لیکن اس وقت کر ہی کیا سکتا ہوں۔ مجھے غیر مسلح پاکر بزدل سردی حملہ آور ہو رہی ہے۔ اچھا مردود کو شام کے وقت دیکھ لیا جائے گا۔

(بنام ساغر ۲۲ مارچ ۱۹۳۷ء)

ایک اور خط میں جوش لکھتے ہیں :-

" ارے صاحب رات بھر مال زادی لو چلتی تھی۔

(بنام ساغر۔ ۲۶ جولائی ۱۹۴۸ء)

یہاں بھی لفظ "مال زادی" کا بے جا استعمال ہے۔ اس میں کوئی چستی اور برجستگی نہیں۔

کبھی کبھی جوش کے ہاں ایک عامیانہ سے لفظ کا استعمال ان کی خوبصورت عبارت کو بھی عامیانہ درجے پر لے آتا ہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:-

" پتھر سے پھول، انگاروں سے شبنم اور مشیت سے رحم وکرم کی توقع کی جا سکتی ہے، مگر آدم کے لونڈے سے شرافت، خلوص اور محبت کی آرزو کسی حالت میں اور کسی شرط کے ساتھ بھی تا قیامت نہیں کی جا سکتی۔"

(بنام ساغر۔ ۱۴ جون ۱۹۳۹ء)

یہاں لفظ "لونڈے" کے استعمال میں عامیانہ پن کی کتنی جہات پوشیدہ ہیں اور جوش کی جنس زدہ نفسیات کی کتنی گرہیں ہیں، ان کے بتانے کی ضرورت نہیں۔

جیسا کہ کہا جا چکا ہے، جوش کو نظم و نثر دونوں پر عبور حاصل تھا۔ وہ ایک عظیم شاعر ہی نہیں باکمال نثر نگار بھی تھے۔ انتہائی دل کش نثر لکھتے تھے۔ ان کے بعض خطوط اعلا انشا پردازی کا نمونہ ہیں۔ لیکن کہیں کہیں جب مراسلے پر مکالمے کا رنگ غالب آتا ہے اور خط میں نجی صحبت یا پرائیویٹ گفتگو کا انداز پیدا ہوتا ہے تو پھر جوش بازاری زبان استعمال کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔ مثال کے طور پر خورشید علی خاں کے نام جوش کے ایک خط کی یہ عبارت ملاحظہ ہو:-

"میں تو بڑے لفڑے میں پڑا ہوا ہوں خورشید صاحب۔ خوب جانتا ہوں
یہ موسم ان لغویات کا نہیں ہے۔ لیکن کیا کروں، میری عقل گدھوں کی
کھائی ہوئی جھوٹی گھانس چر رہی ہے اور میرے سینے کا لونڈا عقل کو
ٹھینگا دکھا دکھا کر سیٹیاں بجا اور "ہپ ہپ ہرّا" کر رہا ہے۔
تھوک میری اوقات پر لعنت میری ذات پہ
بڑا مفکر بنا پھرتا ہے سالا اور اندر اتنا گڑبڑ جھالا"
اگر غیرت ہوتی تو ڈوب مرتا چلّو بھر پانی میں۔ لیکن میں تو "منھ پر پھیری
لوئی، تو کیا کرے گا کوئی" کی حد تک بے حیا ہو چکا ہوں۔"

یہاں تک تو پھر بھی ٹھیک تھا لیکن بعض ایسے مقامات بھی ہیں جہاں یہ بازاری پن ابتذال کی
حدود میں داخل ہو جاتا ہے۔ جیسے خورشید خاں کے نام ان کے اس خط میں:۔

"ایک بجے رات سے جاگ رہا ہوں۔ کچی نیند میں بیدار ہو جانے کے باعث
دماغ سالا اونگھا ہوا ہے اور ایسا محسوس ہو رہا ہے گویا کسی بوڑھی عورت
کے آغوش میں بھینچا ہوا، ادھی اودھی سانسیں لے رہا ہوں۔"

(۳، نومبر ۱۹۷۳ء)

لفظ "سالا" اور "بوڑھی عورت" کی تشبیہہ کے جواز کے لیے یہاں یہ جاننا بھی ضروری
ہو جاتا ہے کہ مکتوب الیہ کے ساتھ ان کی کس درجہ بے تکلفی ہے۔ یعنی یہ کہ اگر اس
بے تکلفی سے مکتوب الیہ کی طبیعت محظوظ ہونے کے بجائے مکلّف ہوئی ہے تو پھر اس طرح
کے اندازِ تحریر کو عامیانہ ہی نہیں رکیک کہا جائے گا۔

خورشید علی خاں کے نام ایک اور خط کا یہ اقتباس بھی ملاحظہ ہو:۔

"قلم بے حد خراب ہے، روشنائی دینے کے بعد حرام زادہ لکھ نہیں
رہا ہے۔ جائے سالا ......"

جس وقت ہم کسی کو خط لکھ رہے ہوتے ہیں تو گویا اس وقت ہم اس شخص کے
ساتھ مکمل تنہائی میں ہوتے ہیں۔ ایک ایسی تنہائی جس میں کسی دوسرے کا دخل

نہیں ہوتا۔ ایسی صورت میں اگر لکھنے والے کا اپنے مکتوب الیہ کے ساتھ کسی نہ کسی نوعیت کا والہانہ جذباتی ربط بھی ہو تو یہ تنہائی اسے برانگیختہ بھی کر سکتی ہے۔ جس سے وہ حدِ اعتدال سے گزر کر ایک طرح کی بیمار ذہنیت میں مبتلا ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے ساغر نظامی کے نام جوش کے ایک خط کا یہ جملہ :-

" اچھا اب رخصت ہوتا ہوں میری دلہن۔ "

(۲۶ر جولائی ۱۹۴۸ء)

جوش کے خطوط میں فحش الفاظ وکلمات کی مثالیں دینے سے پہلے ایک اہم بات عرض کرنا چاہتا ہوں۔ جوش ادبی محفلوں اور مشاعروں میں تو ہمیشہ مہذب رہے۔ انھوں نے کبھی فحش باتیں نہیں کیں۔ البتہ اپنے بے تکلف دوستوں کے ساتھ نجی صحبتوں میں وہ کھل کھیلتے تھے اور ہر طرح کی گفتگو جائز سمجھتے تھے۔ فحش لطیفے اور فحش اشعار سناتے گالیوں کا استعمال کرتے اور دوستوں سے فحش مذاق بھی کرتے۔ اُن کی اس فحاشی کا کسی نے سنجیدگی سے ذکر نہیں کیا۔ اس لیے اس سلسلے میں کسی نے اُن کی مذمت بھی نہیں کی۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا جوش کے ان خطوط کی ایسی نجی صحبتوں اور محفلوں کی حیثیت نہیں ہے جس میں انسان کے منھ میں جو آتا ہے وہ کہہ دیتا ہے۔ جوش کو یقین تھا کہ جن لوگوں کو انھوں نے اس طرح کے خطوط لکھے ہیں اُن کا اخلاقی فرض ہے کہ وہ انھیں ضائع کردیں یا کم از کم انھیں کبھی شائع نہ کریں، لیکن اگر اُن کے مکتوب الیہم ایسے خطوط کو شائع کرادیں، اس کے لیے وہ ذمّے دار خود ہیں جوش نہیں۔

اب تک جوش کے جو خطوط میری نظر سے گزرے ہیں اُن میں سب سے زیادہ فحش اور ناشائستہ الفاظ اور کلمات راغب مرادآبادی کے نام لکھے گئے خطوط میں ملتے ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ میکش اکبرآبادی مرحوم کے خطوط میں بہت زیادہ فحش الفاظ کا استعمال کیا گیا۔ میکش صاحب کے صاحبزادے کے پاس یہ خطوط ہیں انھوں نے یہ خطوط مجھے دینے سے انکار کر دیا۔

جوش اور ساغر کے تعلقات کا آغاز ۱۹۲۲ء یا ۱۹۲۳ء میں ہوا تھا۔ جوش اس زمانے

عمر میں ساغر سے دس سال بڑے تھے۔ لیکن ساغر کے نام جوش کے خطوط کے مطالعے اور خاص طور پر اُس خط کے مطالعے سے جو دونوں کے درمیان تعلقات میں کشیدگی پیدا ہونے کے بعد ساغر نے جوش کے نام لکھا تھا۔ ان دونوں کے درمیان غیر معمولی بے تکلف تعلقات کا پتا چلتا ہے۔ اپنے لیے خطوط میں یہ دونوں ہی فحش کلمات استعمال کرتے تھے یا صرف جوش، یہ کہنا مشکل ہے۔ اس لیے کہ مجھے جوش کے نام ساغر کا صرف ایک ہی خط ملا ہے۔ (ساغر بنام جوش ص ص ۳۴-۴۳) اس ایک خط کی بنیاد پر اس معاملے میں کوئی نتیجہ اخذ کرنا ممکن نہیں ہے۔ ہاں جوش نے ساغر کے نام جو خطوط لکھے ہیں اُن میں خاصی تعداد ایسے خطوط کی ہے جن میں فحش عبارتیں ہیں۔ ساغر کے نام جوش کے ایسے فقرے بھی مجھے دیکھنے کو ملتے ہیں جن میں ذم کا پہلو ہوتا ہے۔ ساغر "پیمانہ" نام سے ایک ماہنامہ نکالتے تھے۔ لفظ "پیمانہ" کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے انھیں لکھتے ہیں:

"آپ کا "پیمانہ" ماشاءاللہ بہت ترقی کر رہا ہے۔ خدا نظرِ بد سے بچائے۔"

(۱۶ر فروری ۱۹۲۴ء)

اس کے ساتھ ہی دوسرا فقرہ ہے:-

"حضرت سیماب کی خدمت میں مخلصانہ تسلیم" اہلِ نظر اور واقعات سے واقف حضرات سمجھ سکتے ہیں کہ یہاں اشارہ ساغر اور سیماب سے متعلق کس بات کی طرف ہے۔

ساغر نے میرٹھ محلہ نوگزے میں مکان کرائے پر لیا۔ جوش نے "نوگزے" سے ذم پیدا کرتے ہوئے لکھا ہے:

"آپ نے اپنا اچھا خاصا محلہ چھوڑ کر دوسرا محلہ کیوں پسند کیا۔ اب نوگزے سے ہی کام چل سکتا ہے۔ یہ وسعت مبارک ہو۔"

(۴ر مارچ ۱۹۳۶ء)

ساغر نے ایک خط میں جوش کو لکھا ہے کہ "آپ دھوکا نہیں دیتے، کھاتے ہیں۔" جوش نے ساغر کے اس فقرے کے دو الفاظ سے ذم پیدا کرتے ہوئے ساغر کو لکھتے ہیں:-

"آپ دھوکا نہیں دیتے، دھوکا کھاتے ہیں۔ یہ "دینے" اور "کھانے کی بات بھی بڑے مزے کی ہے۔"
(بنام ساغر، ۸، نومبر ۱۹۴۸ء)

ساغر کے نام ایک اور خط میں لکھتے ہیں :-

"سنجیدہ باتیں ختم ہوئیں، آیئے ذرا بیہودگی کرلیں۔

۱۔ کل رات کو ایک سوتے ہوئے مرد پر ایک رنڈی چڑھ بیٹھی۔ ایسے شخص کو عورت کا گانڈو کہنا چاہیے۔

۲۔ رام پوری اسلم خاں ایک امرد شاعر کو گھر میں ڈالے ہوئے ہیں۔ مجھے اس کی تعریف میں مضمون بھیجا ہے کہ شائع کردو۔ دکھ سہیں بی فاختہ اور کوّے انڈے کھائیں۔

۳۔ فرقوا (فراق گورکھپوری) بڑے مزے کر رہا ہے اور ہم ہیں کہ ٹاپتے پھرتے ہیں۔

۴۔ کل رات کو بستر پر آپ کی یاد آئی۔ میانی میں زلزلہ آگیا۔"

(۵۔ جون ۱۹۴۹ء)

غرض جو جنسی ہیجان اور ولولہ شاعری کے میدان میں ان کی "کوہستان دکن کی عورتیں" جیسی اکثر نظموں میں نظر آتا ہے وہی اور زیادہ کھلی اور فحش شکل میں ان کے ان خطوط میں بھی دیکھنے کو ملتا ہے جو ان لوگوں کے نام ہیں جن کے ساتھ وہ بے تکلفی میں جامے سے باہر ہوئے جاتے ہیں۔ چناں چہ ساغر کے نام ایک خط میں ایک شعر لکھتے ہیں :-

دنیا کے سرد و گرم نے "ل.... تھما دیا
آئے تھے آرزوئے گلِ تر لیے ہوئے

(۱۵۔ جون ۱۹۴۹ء)

کبھی کبھی وہ فحش الفاظ کو توڑ مروڑ کر ایسی شکل دے دیا کرتے تھے کہ عام آدمی کا

ذہن اُن تک نہ پہنچ سکے۔ ساغر کے نام اپنے ایک خط مورخہ ۱۷ نومبر ۱۹۶۷ء میں لکھتے ہیں :-

"میاں ساغر، بعد اظہارِ "مالغا" معلوم ہو۔

ظاہر ہے کہ یہاں "مالغا" سے مراد "اغلام" ہے۔ اسی خط میں آگے چل کر رقم طراز ہیں :-

"کل صبح کو رام پور یعنی دارالخلافت لوطیان جا رہا ہوں۔"

خورشید علی خاں کے نام خط میں لکھتے ہیں :-

پرسوں سلامت علی خاں آئے تھے۔ ایک لونڈے کو بھی ساتھ لائے تھے۔ اُن کو دیکھ کر آپ کی یاد ستائی اور کراچی کی ہوا آنے لگی۔

(۷ ستمبر ۱۹۷۴ء)

ساغر کے نام ایک اور خط میں جوشؔ لکھتے ہیں :-

"اتنا طویل و عریض چوتیا جیسا "سگروا" ہے۔ خدا کی قسم آج تک دیکھنے میں کیا سننے میں بھی نہیں آیا ہے۔ خیر ہمیں کیا۔ ہمیں "ساگر" سالے سے محبت ہے۔ وہ مانے یا نہ مانے۔ "ل" سے سارا مجبا کھراب کر دیا۔ سالے "ساگر نے" (۲۶ جولائی ۱۹۴۸ء)

جعفر حسین کے نام خط میں جوشؔ لکھتے ہیں :-

"اگر خدانخواستہ زندہ رہا تو سالِ آئندہ (پونے سے کلکتے) آؤں گا اور ہر شخص کے فوطے چھو چھو کر استدعا کروں گا کہ وہ میری آمد سے آپ کو باخبر نہ کرے۔"

(۲۰ ستمبر ۱۹۴۶ء)

اس خط میں جوشؔ لکھتے ہیں۔

"جب آپ پونے تشریف لائیں گے تو میں آپ کا ٹھنڈی نونی سے استقبال کروں گا۔"

راغب مراد آبادی کے نام ایک خط میں جوش لکھتے ہیں:

"آج ہفتے کا دن ہے، ڈھائی بجنے کے قریب ہیں، تھوڑی دیر میں تمام ملاعنہ جمع ہو جائیں گے منور کے کمرے میں اور یہ کافر، اسلام آباد میں .... پکڑے بیٹھا رہے گا۔ تفو، بر تو، اے چرخِ گرداں، تفو! ہائے زندگی نے جو یہ آخری صحبت پائی تھی، سو وہ بھی چھن گئی۔ اس دنیائے دنی کی ماں کا بھوسڑ۔ منور عباس صاحب سے میرا سلام نہ کہیے گا، وہ بے مروت انسان ہیں۔ (اس کی تفصیل پھر کبھی لکھوں گا) مجھ کو غالباً ایک ہفتہ میں فون مل جائے گا اور آپ سے لسانی جفتی ہونے لگے گی۔"

(بنام راغب مراد آبادی، ۱۰ جولائی ۱۹۷۲ء)

جوش صاحب اکثر بے وجہ فحش گالیاں دیتے ہیں۔ اپنے عزیز دوست مرزا جعفر حسین کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"اب رہے مالدار" احباب" سو وہ مادر .... "قبلہ جوش صاحب" تو کہتے ہیں، لیکن تیوروں سے بتا دیتے ہیں کہ ع زر می طلبی سخن درین است .... لعنت اِس روزگارِ سفلہ پرور پر۔ بلکہ اس سے زیادہ لعنت ہم پر کہ ہم سفلہ نہیں ہیں اور نہ بن سکتے ہیں، ماں کا ــــ اِس شرافت اور اس ادبیت کا۔"

(بنام مرزا جعفر حسین، ۲۷ ستمبر ۱۹۵۰ء)

منور عباس کے نام ایک خط کا اقتباس ملاحظہ ہو:۔

"دسمبر تک، اگر، خدانہ خواستہ جیتا رہا، تو کراچی آؤں گا اور گدھے کے لِ کے مانند، پوری سبھا کی گ یں گھس جاؤں گا۔

چار بج کر، پانچ پر، جب وہ پڑا ہو جائے گا۔ سمجھے "پڑا ہو جائے گا" کے معنی ہیں جب وہ لونڈا لیٹ جائے گا۔ داد دیجئے اِس نئے طرزِ بیان کی۔۔۔ہاں تو پورا شعر سنئے۔

چار بج کر، پانچ پر جب وہ پڑا ہو جائے گا
چار بج کر سات پر ... کھڑا ہو جائے گا

تھام لے پنڈت امر ناتھ کا ۔۔ لو۔

۲۷ ستمبر ۱۹۵۰ء کے خط میں جوشؔ بے تکلفی سے ماں کی گالیاں لکھتے ہیں۔

۱۲ اگست ۱۹۴۶ء کے ایک خط میں جعفر حسین کے نام جوشؔ نے عمر خیام کی ایک رُباعی کا مصرع اس طرح لکھا ہے:

بیا بیا کہ ترا تنگ در ازار کشم

"ازار" پاجامے کو کہتے ہیں۔ یہ مصرع عمر خیام کی ایک رباعی کا ہے۔ اصل ہے "بیا بیا کہ ترا تنگ در کنار کشم" جوشؔ نے "در کنار" کو "در ازار" سے بدل دیا ہے۔

بعض اوقات جوشؔ بغیر کسی سیاق و سباق کے بھی خط میں فحش باتیں کرنے لگتے ہیں۔ خورشید علی خاں اُن سے عمر میں بہت چھوٹے ہیں اور خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ جوشؔ کا بہت احترام کرتے ہیں۔ اس کے باوجود جوشؔ اُن کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:-

"آپ کو خوابوں میں دیکھ کر غسل کرنے والا جوشؔ

(۱۲۔ نومبر ۱۹۷۳ء)

ایک اور خط میں تو جوشؔ نے حد ہی کر دی۔ لکھتے ہیں:-

"آپ میرے کام کے واسطے اپنا کام چھوڑ کر دوڑتے ہیں۔ آپ کی اس ادا پر غور کرتا ہوں تو بڑے زنّاٹے کے ساتھ استادگی ہونے لگتی ہے۔

آپ کو خوابوں میں دیکھ دیکھ کر بار بار غسل کرنے والا

(خورشید علی خاں، یکم اگست ۱۹۷۴ء)

خورشید علی خاں کے نام ایک اور خط میں جوشؔ لکھتے ہیں:

"تھام لے گردھاری لال کا "دل"۔

(۲۳ ستمبر ۱۹۷۲ء)

یکم اگست ۱۹۷۴ء کے ایک خط میں خورشید علی خاں کو لکھتے ہیں:-

کچکچا کر آپ کو کلیجے سے لگا دُوں گا اور فوراً جھڑ جاؤں گا۔"

بعض اوقات جوشؔ چوتیا، چوتیاپن، اور چوتیاپا جیسے الفاظ بے تکلف استعمال کرتے ہیں۔ غالبؔ نے بھی خط میں لفظ "چوتیا" استعمال کیا ہے، مگر بس ایک جگہ۔ جوشؔ لکھتے ہیں:۔

"لاحول ولا۔ پھر چوتیاپن کرنے لگا میں"

(بنام ساغر ۸۔ نومبر ۱۹۴۸ء)

"اور چوتیے پن کی حد کر دی۔"

(بنام ساغرؔ۔ ۴۔ فروری ۱۹۴۹ء)

"سخت چوتیاپے میں مبتلا ہو۔"

(بنام ساغرؔ۔ ۴ر جنوری ۱۹۴۹ء)

سفارش

جوشؔ اپنے بیٹے، داماد اور بھانجے ہی کی سفارش نہیں کرتے، دوسرے لوگوں کی ملازمت یا کام کے لیے بھی کوشش کرتے تھے۔ انھوں نے ایک نوجوان کے لیے ریڈیو پروگراموں کی ساغرؔ صاحب سے سفارش ان الفاظ میں کی ہے:۔

"حضرت ساغرؔ۔ اِس بچے کا بیان ہے کہ وہ ریڈیو کے بچوں کے پروگرام میں دو بار شریک ہو چکا ہے۔ آپ پھر دیکھ لیں۔ کار آمد ثابت ہو تو اسے موقع دیں۔"

(۳۰۔ ستمبر ۱۹۵۴ء)

ایک اور نوجوان کی سفارش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"حضرت ساغرؔ، مہربانی کر کے سعی کیجیے کہ حاملِ رقعہ کو ریڈیو پر زمزمہ خوانی کے پروگرام ملیں اور ملتے رہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے نوجوانوں کی ہمت افزائی میں کوتاہی نہ کریں۔" (۲۸ر جنوری ۱۹۵۵ء)

عام طور سے وہ سادے لفظوں میں سفارش کرتے ہیں، لیکن اپنے عزیز دوست حکیم محمد بشیر مخمور کی سفارش بہت پُرزور الفاظ میں کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

" یہ خط جناب کو ایک بہت بڑی سخت اور اہم ضرورت کے ماتحت بھیج رہا ہوں۔ اُمید قوی ہے کہ آپ بھی اس کی اہمیت میری ہی طرح محسوس فرمائیں گے۔

"لکھنؤ میں اطبائے جھوائی ٹولہ کا خاندان ہندوستان میں ایک مشہور اور قدیم علمی گھرانا ہے اور اس کی طبی عظمت سے کم لوگ ہوں گے، جو واقف نہ ہوں۔ اسی خاندان کے ایک ہونہار فرد میرے مخلص ترین دوست حکیم محمد بشیر صاحب مخمور سابق پروفیسر تکمیل الطب کالج و منبع الطب کالج ہیں، جن کو میں آپ کی خدمت میں بھیج کر آپ سے متعارف کرا رہا ہوں۔ موصوف اپنے فن میں کامل دستگاہ رکھنے کے علاوہ ایک جیّد ادیب و شاعر بھی ہیں مگر ان تمام اوصاف کے باوجود آج کل حد درجہ پریشان و مضطرب ہیں۔ ان کی پریشانی کا بہت بڑا سبب آپس کا خاندانی اختلاف ہے، اور کچھ اتفاقات و حوادث۔ میں موصوف کی قابلیت اور ذہانت سے اس قدر متاثر ہوں کہ جناب کی تمام و کمال ہمدردی اور علم نوازی کو ان کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔

میں چاہتا ہوں کہ آپ کوئی صورت خواہ بطور" امداد شفاخانہ خواہ بطورِ "طبیب" خواہ اس طرح کہ ایک رقم اتنی ان کو حاصل ہو جائے کہ باطمینان یہ مطب اور دواخانہ کرلیں" فرمائیں۔

آخر میں پھر مکرر عرض کرتا ہوں کہ آپ کوئی نہ کوئی صورت ان کے لیے ضرور نکالیں اور مجھے ہمیشہ کے لیے ممنون فرمائیں۔"

(۲۸ اپریل ۱۹۳۹ء)

آوازیں

جوشؔ خطوط میں طرح طرح کی آوازوں کو الفاظ کے پیکر میں ڈھالتے ہیں۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ یہ آوازیں سیاق و سباق کے لحاظ سے بامعنی ہوں، ورنہ اکثر بے موقع اور بے معنی ہوتی ہیں۔ نفسیاتی اعتبار سے ان آوازوں کی یقیناً اہمیت ہے لیکن ابھی تک کسی نے جوشؔ کے خطوط میں ان آوازوں کی پیکر سازی کا مطالعہ نہیں کیا۔ میں نے دو ماہرینِ نفسیات سے رجوع کیا۔ لیکن وہ دونوں کچھ نہیں بتا سکے۔ اب ان کی آوازوں کی کچھ مثالیں ملاحظہ ہوں۔ خورشید علی خاں کے خط میں جوشؔ نے لکھا ہے :۔

"اور جب وہ (خورشید علی صاحب کی محبوبہ) چھم سے آپ کی خلوت کدے میں قدم رکھے، اُس آن آپ کی بیگم دھم سے کود پڑیں چھت سے، اور عاشق و معشوق دونوں کی پشت پر دھما دھم مکّے پڑنے لگیں اور پھر آپ کی چیخ اور اُس کا پیشاب نکل جائے۔"

(مورخہ ۲۳۔ستمبر ۱۹۷۲ء)

اس عبارت میں "چھم، دھم" اور "دھما دھم" بامعنی آوازیں ہیں اور ان کا برجستہ استعمال کیا گیا ہے لیکن اب ایسی مثالیں ملاحظہ ہوں جن میں آوازیں بے معنی ہیں اور بے موقع ہیں۔

کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ کے نام خط کی ابتدا اس طرح کرتے ہیں :۔

"ڈھائیں، ڈھائیں، اڑا اڑا دھوں۔ غوں، غوں، غوں۔ ارے، یہ یہ بے پناہ دھماکے یہ شور و غل۔ یہ شکست و ریخت، یہ تباہی و بربادی اور یہ ہولناک بم باری، خدا کی پناہ، کوئی خدا کے لیے بتاؤ یہ کیا غلغلہ و ہنگامہ ہے۔"

(مورخہ ۱۱ ؍مارچ ۱۹۵۳ء)

جوشؔ ذہین شاہ بابا کو لکھتے ہیں :۔

"آسمان سے آواز آنے لگتی ہے، "قربان جاؤں، پہچان لیا" "قربان جاؤں،

پہچان لیا۔" تاتا تھیا، تاتا تھیا۔" (مورخہ ۲۲ جولائی ۱۹۷۲ء)

ہلاؔل نقوی کے خط کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:۔

ہلاؔل میاں مبارک ہو، کل پدرین جانے کے بعد (شادی کے بعد تمھاری آب و تاب میں تو ضرور اضافہ ہو جائے گا۔ مگر بانکپن باقی نہیں رہے گا۔

"مبارک باد۔ کڑم دھم، کڑم دھم۔"

(مورخہ ۲۹۔ جون ۱۹۷۸ء)

اگر کوئی ماہر نفسیات جوؔش کی تحریروں میں اس طرح کی آوازوں کا مطالعہ کرے تو عین ممکن ہے کہ اس سے جوؔش کی شخصیت اور ذہن کے بعض اہم پہلوؤں کا انکشاف ہو۔

یہ تمام آوازیں جن کا ذکر یہاں کیا گیا لسانی آوازیں نہیں۔ یہ ایسی آوازیں ہیں جو ماحول میں چیزوں کی رفتار یا ان کے دوسری چیزوں کے ساتھ متصادم ہونے سے پیدا ہوتی ہیں جن کی نقل انسان اپنی تقریر یا تحریر میں ایسے موقعے پر کرتا ہے جب کسی مخصوص کیفیت کو بیان کرنے کے لیے اسے لغت میں کوئی لفظ نہیں ملتا۔ البتہ اس کی کوئی نہ کوئی آواز اسے اندرونی کیفیت کے عین مطابق نہیں تو کم از کم قریب تر ضرور محسوس ہوتی ہے۔ جوؔش نے ایسی آوازوں کا استعمال اکثر مقامات پر اپنی شاعری ہی میں، یا پھر اظہار کے مسائل سے دوچار ہو کر بچّے طرح طرح کی غیر لغوی آوازیں نکالتے ہیں۔ ہو سکتا ہے یہ کسی جنسی ہیجان یا ولولے پر اظہار کی بے بسی کا ردِ عمل ہو۔ بہر حال اس کا تفصیلی مطالعہ دل چسپ ہو سکتا۔ ہے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ زندگی کے آخری دِنوں میں جوؔش بالکل ٹوٹ گئے تھے، خود جوؔش کے بقول اُن کے دِل میں گھُن لگ گیا تھا، پھر بھی وہ غم و آلام کے سلسلے میں سینہ سپر رہے ...... وہ بظاہر ایک کامیاب اور بشاش انسان نظر آتے تھے۔ اپنی بیٹی سعیدہ خاتون کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"غور کرو، میری ایک جان ہے اور اتنے روگ ہیں۔ میری دانش مندی مجھ کو بہلاتی رہتی ہے۔ ہنستا بولتا ہوں لیکن گھُن لگا ہوا ہے دل میں ــــ جاگتے سوتے ضربیں لگتی رہتی ہیں میری جان پر ــ رئیس (جوشؔ کے چھوٹے بھائی، جن سے جوشؔ کو بے انتہا محبت تھی) نے بھی مجھ سے منھ موڑ لیا۔ کاش وہ میری لاش پر روتا۔ ہائے میرا بھائی، میرا محبوب بھائی مجھ سے بچھڑ گیا اور میں نامُراد مرنے کا نام نہیں لیتا۔ میری بشاشتوں، میری سر کوزطلبیوں اور میرے قہقہوں سے دھوکا نہ کھا۔ بیٹی میں اندر سے اس قدر زخمی ہوں جس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔

سرسبز ہوں بظاہر، باطن میں خون ہے دل"

(۳۱ر اکتوبر ۱۹۷۳ء)

عمر کی آخری منزل میں بھی جوشؔ زندگی کے مصائب و آلام کے مقابلے میں اپنی خوش مزاجی، خوش دلی اور قہقہوں کو سپر بنائے رہے۔ خورشید علی خاں کے نام ایک خط میں اپنی زندہ دلی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"پھر بھی داد دیجیے میری سخت جانی یا بہادری کی کہ دوستوں کے حلقے میں بیٹھ کر قہقہے مارتا ہوں، انفس و آفاق کے اسرار پر غور کرتا ہوں اور ملازمت کے دغدغے بھی سہتا ہوں۔ ہر چند تین عدد موذی میموں یعنی مسائل، معاشقے اور معاش میں گھری ہوئی ہے۔ پھر بھی خوش دلی سے باز نہیں آتا اور برپا پوش قلندر کے نعرے لگاتا رہتا ہوں۔"

(۱۲۔ جولائی ۱۹۷۵ء)

جوشؔ نے اپنی خود نوشت "یادوں کی برات" میں اپنے اٹھارہ عاشقوں کا ذکر کیا ہے۔ حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ یہ تعداد اٹھارہ سے کہیں زیادہ ہے۔ ان کا آخری عشق ۱۹۷۲ء کے آس پاس ہوا۔ جب کہ ان کی عمر لگ بھگ چھیتر (۷۶) سال تھی۔ اس عشق میں بھی نوجوانی کے سے عشق کی شدت تھی۔ جوشؔ کی شاعری دوبارہ جوان اور تر و تازہ ہو گئی۔ خود جوشؔ نے اس زمانے کی اپنی شاعری کے بارے میں شعر

کہا ہے :۔

تا شاعری کی مانگ کو صندل سے بھر سکوں
بارِ دگر جوان بنایا گیا ہوں میں

اس عشق میں گرفتار ہو کر جوش نے عشق و محبت کے بارے میں بڑی دلچسپ باتیں کہی تھیں۔ جوش ایک محفل میں اپنی نظم سنا رہے تھے۔ نظم کا ایک شعر تھا :۔

اے وائے کہ دل کے اُفقِ عید پہ اے جوش
پھر چاند محرم کا نمودار ہوا ہے

جیسے ہی جوش نے نظم ختم کی ان کی محبوبہ سمن نے پوچھا "جوش صاحب! کیا آپ محبت کے جذبے کو محرم کا چاند سمجھتے ہیں۔ بقول خورشید علی خاں صاحب جوش نے :۔

" ایک آہ سرد کے ساتھ کہا "جی ہاں! ہمارے جہل گزیدہ اور وہم پرور معاشرے میں محبت کرنا نا قابل تلافی جرم سمجھا جاتا ہے۔ ارے سر پیٹ کر مر جانے کی بات ہے۔ یہاں ایک دوسرے کو قتل کرنا بہادری اور شجاعت کی علامت ہے اور محبت کرنا ایسا معیوب فعل سمجھا جاتا ہے کہ اس کا اظہار نا قابلِ معافی جرم ہے۔" [1]

ان کی آخری عمر کے خطوط آخری عشق پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ خورشید علی خاں صاحب نے اپنی کتاب "ہمارے جوش صاحب" میں اس عشق کے بارے میں کافی تفصیلات فراہم کر دی ہیں۔ یہ خطوط ان تفصیلات کی تصدیق کرتے ہیں۔ وہ لڑکی بھی اظہارِ عشق میں جوش سے پیچھے نہیں تھی۔ اس لڑکی سے جوش کے عشق کی تفصیلات خورشید علی کی کتاب "ہمارے جوش صاحب" اور راغب مراد آبادی کے مُرتّبہ "خطوطِ جوش ملیح آبادی" سے ملتی ہیں۔ یہ لڑکی شاعرہ تھی اور اس کا فرضی نام سمن تھا۔ انیس بیس سال کی عمر تھی۔ اتنی کم عمر تھی کہ جوش صاحب کی نواسیوں کی ہم جماعت تھی۔ بقول خورشید علی خاں :۔

---

[1] ہمارے جوش صاحب، خورشید علی خاں، ص ۲۳۹)

"شعر تو خیر جیسے تیسے کہتی ہو گی، مگر غضب کی شعر فہم ہے، قد درمیانہ اور رنگ کھلتا ہوا چمپئی اور چہرے پر جوانی کی کشش اور بات کرنے کی ادا نہایت دلفریب۔" جوشؔ صاحب نے اپنے دو نوجوان دوستوں خورشید علی خاں اور راغب مرادآبادی کے نام خطوط میں کئی بار اس نوجوان محبوبہ کا ذکر کیا ہے اور ایک دو خطوں میں اس کی بڑی بہن کا ذکر اس طرح کیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جوشؔ کی نظر شاید اس پر بھی تھی۔ ۱۷ اگست ۱۹۷۳ء کے ایک خط میں خورشید علی خاں کو لکھتے ہیں:۔

"کل سارا دن "اُس" کے ساتھ گزرا۔ اُس کی بڑی بہن نے کہا بھی کہ اب جوشؔ صاحب کو آرام کرنے دو، اپنے کمرے میں چلی جاؤ لیکن وہ فتنۂ روزگار میرے پہلو سے نہیں اُٹھی، اور عشوہ و ناز کے خنجر مارتی رہی۔

روزگار نے مجھ پر اس خبیث عمر میں دو کٹیلی چھوکریوں کو مسلّط کر دیا ہے۔ ہر چند میرے چہرے پر ماہ و سال کی شکنیں دوڑ چکی ہیں، اور میرے خط و خال کی کمر ٹوٹ چکی ہے لیکن روحِ کائنات نے، خدا جانے، ان لونڈیوں پر کیا جادو کر دیا ہے کہ وہ میری دل داری پر کمر باندھے رہتی ہیں، وہ میرے چہرے کے بھیانک پن کو دیکھتی ہی نہیں، وہ کہتی ہیں، ہم کو حسین چہرے کی نہیں حسین ذہن کی ضرورت ہے۔ ارے کروڑوں کسنوں میں ایک آدھ چھوکری اس مزاج کی بھی نکل آتی ہے۔ جو شاعر کے غروب کی تیرگی کو، طلوع کی جگمگاہٹ میں تبدیل کر دیتی ہے۔

ان الھڑوں سے متاثر ہو کر ایک نظم کہی ہے، آپ بھی سُن لیں:۔

ترانۂ شکر

دیارِ خال و خد کے حکمراں ہیں
کہ ہم محبوبِ قومِ گُل رُخاں ہیں

کڑی کرنوں کا منھ اُترا ہوا ہے
گھنی زلفوں کے ہم پر سائباں ہیں
نہ کیوں نازاں ہوں، اپنی ذات پر ہم
کہ ملجائے نیازِ دل براں ہیں
زہے قسمت ہماری آرزو میں
کسی کی آنکھ سے آنسو رواں ہیں
بڑی حسرت سے حوریں تک رہی ہیں
خدایا۔ ہم، یہ کس کے میزباں ہیں
ابھی تک ہیں حکایت در حکایت
ابھی تک داستاں، در داستاں ہیں
برہمن ہیں مگر ایسے برہمن
کہ شاہنشاہِ اقلیمِ بتاں ہیں
بحمد اللہ کہ ہم، اس عمر میں بھی
تمنائے دلِ دوشیزگاں ہیں
حسینوں کی رفاقت سے ہم اے جوش
زہے قسمت کہ اب تک نوجواں ہیں

خورشید علی خاں کے نام ایک خط سے پتا چلتا ہے کہ ایک دفعہ جب سمن کراچی آئیں تو جوش اور اُن کی محبوبہ کے وصل کا انتظام خورشید علی خاں صاحب نے کیا۔ جوش خورشید علی خاں کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

"ارے بس! میں نے بڑی لجاجت سے فون کیا کہ عابد سے یہ دریافت کر کے مجھے فون کر دیجیے کہ میری فتنۂ آخرالزماں کس تاریخ کو روانہ ہو رہی ہے، لیکن آپ اس خیال سے ٹال گئے کہ آپ کے فون کا بل بڑھ جائے گا۔ اسی کا نام ہے دوستی ؟ دس بارہ روپے بچائے اور

میرا دل توڑ دیا۔
جی چاہتا ہے آپ کی اس بخل آلودہ بے مہری پر اس قدر لکھوں کہ آپ کے ماتھے سے پسینے کی بوندیں ٹپکنے لگیں، مگر یہ سوچتا ہوں کہ آپ کہیں گے کہ یہ جوش کس قدر احسان فراموش ہے۔ اگر میں نہ ہوتا تو یہ ناشکرا دل بچڑے پکڑے پھرتا۔ اس کو تخلیہ میسر نہ آتا اور اس کے لب و آغوش اس پیکرِ ناز کے لعلِ نگاریں اور اس کے نرم جسم سے لطف اندوز نہ ہو سکتے۔

(۶ اگست ۱۹۷۵ء)

جوش اپنی محبوبہ سمن کو "فتنۂ آخر الزماں" کہا کرتے تھے۔ خورشید علی خاں کے نام کئی خطوط میں اُن کا ذکر ہے۔ ۲ فروری ۱۹۷۵ء کے خط میں خورشید صاحب کو جوش لکھتے ہیں :-

"ہائے میری فتنۂ آخر الزماں بھی تقریباً ایک سال سے بیمار ہے اور اس کی بیماری کا تسلسل گھُن کی طرح میری زندگی کو چاٹے جا رہا ہے۔ ہم تبرک ہیں، بس اب کرلے زیارت مجنوں۔

ایک اور خط میں جوش لکھتے ہیں :-

"جی ہاں، اب وہ اگلی سی مُعلّقیت باقی نہیں رہی ہے، بال و پَر نکل آئے ہیں۔ لاہور جانے کی طاقت آگئی ہے۔ امّ الشعراء (بیگم جوش کی آمد کا انتظار ہے۔ وہ آلیں تو لاہور جا کر کوے جاناں کا طواف کر آؤں۔

اس عمر میں جوش نے فراق اور وصال دونوں کے مزے لوٹے۔ ایک دفعہ جوش سمن کی رفاقت میں زندگی گزارنے کا لطف اُٹھا رہے تھے کہ اس کے والدین آگئے۔ انھیں جوش اور سمن کے تعلقات کا پتا چل گیا تھا وہ سمن کو جوش کے پاس سے اُٹھا کر لے گئے۔[1]

[1] اس واقعے کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "ہمارے جوش صاحب" : ص ص ۴۴۵ - ۴۵۰)

راغب مرادآبادی نے اپنی کتاب "خطوطِ جوش ملیح آبادی" میں سمن کے نام جوش کے تین چار خطوط اور جوش کے نام سمن کے ایک خط کے عکس شائع کیے ہیں۔

اگرچہ جوش ہنس ہنس کے غم جھیلنے کے عادی تھے لیکن آخر عمر کے کچھ خطوط میں اُن کی بعض ایسی درد انگیز عبارتیں ملتی ہیں جو ہمارے دل و دماغ کو ہلا کر رکھ دیتی ہیں۔ ان عبارتوں میں تصنع اور بناوٹ نہیں ہے، بلکہ حقیقی احساسات اور جذبات کی ترجمانی ہے۔ جو حضرات جوش کی جوانی کے حالات سے واقف ہیں انھیں معلوم ہے کہ جوش کیسے مجلسی انسان تھے۔ اُن کے قہقہے، لطیفہ گوئی، حاضر جوابی، فی البدیہہ سنجیدہ اور مبتذل شعر گوئی محفل کو زعفران زار بنائے رکھتی تھی۔ ان کے دم سے محفلوں میں رونق تھی لیکن بڑھاپے میں وہی جوش اپنے پرانے دوستوں سے دور کراچی اور اسلام آباد میں جا پڑے۔ ظاہر ہے کہ یہاں نئے تعلقات قائم کرنا ممکن نہیں تھا۔ کچھ لوگوں سے دوستی ہوئی بھی لیکن ان میں سے کوئی بھی کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، عرش ملسیانی، شنکر پرشاد، ساغر نظامی اور بسمل سعیدی جیسا یارِ غار نہیں تھا۔ کراچی میں تو انھوں نے نوجوانوں یا اپنی عمر سے بہت کم لوگوں سے محفل سجالی تھی، لیکن اسلام آباد میں اُن کے ملاقاتیوں کی تعداد بہت کم تھی، اور جو ملنے بھی آتے تھے وہ تاج محل کے زائرین تھے جو یہ دیکھنے آئے تھے کہ عظیم شاعر آخری عمر میں کیسا لگتا ہے۔ اس جوش کو تنہائی کا کرب سہنا پڑتا تھا۔

۳۱۔ اکتوبر ۱۹۷۳ء کو اپنی بیٹی سعیدہ خاتون کے نام ایک خط میں انھوں نے اپنے بیٹے سجاد حیدر کو مخاطب کرتے ہوئے اپنے درد و کرب کا اظہار اس طرح کیا ہے:-

"میرے بیٹے میرے پاس آکر رہو، میری تنہائی پر رحم کرو، جب تمھیں یاد کرتا ہوں، دل سے خون کی بوندیں ٹپکتی ہیں۔ بیٹا تم اس قدر بے رحم کیوں ہو گئے ہو کہ باپ کی مصیبت سے جی چراتے ہو اور

کراچی میں پڑے ہوئے خود کو بھی گھلائے ڈال رہے ہو ..... خدا کے واسطے میری پکار سنو اور میرے آغوش میں آجاؤ ۔"

جوشؔ نے اپنی بیوی کے ساتھ بے انتہا لاڈ اور پیار کیا تھا اور انھیں کبھی کسی طرح کی تکلیف نہیں ہونے دی تھی۔ ساغر نظامی صاحب کی بیگم ذکیہ ساغر صاحبہ نے ایک ذاتی گفتگو میں مجھے بتایا کہ انھیں کچھ عرصہ تک پونے میں طاہر پیلس میں رہنا پڑا۔ اس کے ایک حصّے میں جوشؔ اپنے خاندان کے ساتھ اور دوسرے حصّے میں ساغر نظامی صاحب مع بیوی بچّوں کے رہتے تھے۔ ذکیہ صاحبہ کا بیان ہے کہ جوشؔ اپنی بیوی سے بے انتہا محبت کرتے تھے اور اسی لیے وہ دنیا میں سب سے زیادہ اپنی بیوی سے ڈرتے تھے۔ بیوی کراچی میں بیٹی کے پاس ہیں اور جوشؔ اسلام آباد میں تنہا پڑے ہوئے ہیں۔ دیکھیے کیسے دردانگیز الفاظ میں بیوی کو مخاطب کرتے ہیں :-

"ہائے میری اشرف جہاں، اللہ تم کو سلامت رکھے اور بیوگی کے بعد بھی تم آرام و عزت سے رہو۔ میری شاہانہ مزاج کی تند خو اور میری جیسی باوفا بیوی ـــ"

جوشؔ کی شخصیت اور سیرت اور نفسیات کو سمجھنے کے لیے یہ خطوط اہم ترین ماخذ ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ کوئی ادارہ یا کچھ افراد مہم کے طور پہ جوشؔ کے خطوط کو جمع کریں تاکہ انھیں مرتب کرکے شائع کیا جا سکے۔ ابھی ایسے لوگوں کی تعداد خاصی ہے، جن کے پاس جوشؔ کے خطوط محفوظ ہیں۔ ورنہ اس بات کا قوی اندیشہ ہے کہ ہماری نسل کے بعد یہ بیش بہا ادبی سرمایہ ضائع ہو جائے۔

زیرِ نظر خطوط کے مجموعے میں کچھ ایسی تحریروں کے عکس شائع کیے جا رہے ہیں جو حیدرآباد میں جوشؔ کی ملازمت اور حیدرآباد سے اُن کے اخراج کے بارے میں بہت اہم ہیں۔ ان میں نواب حیدرآباد کے فرامین بھی شامل ہیں۔ اُن تحریروں کی اصل آندھرا پردیش اسٹیٹ آرکائوز حیدرآباد میں محفوظ ہیں۔ ڈاکٹر سید داؤد اشرف نے اپنی کتاب "بیرونی مشاہیرِ ادب" میں ان تحریروں کے عکس شائع کیے ہیں۔ اشرف صاحب کے شکریے کے ساتھ یہ عکس اس کتاب میں بھی شائع کیے جا رہے ہیں۔

خطوط

عبدُالماجد دریابادی

(۱)

۱۹ ستمبر ۱۹۲۱ء

مشفق، بچہ بہت بیمار ہے اور ہاتھ میں تکلیف ہے۔ صرف دو باتیں سن لیجیے۔ اکبر[۱] دنیا سے اُٹھ گئے۔ میرے دل میں سناٹا پڑا ہے اور سینے کے اندر کوئی پھوٹ پھوٹ کے رو رہا ہے۔ ایک تعزیت کا جلسہ کرنے کا قصد ہے اور یہ تحریک پیش کرنا ہے کہ حضرت لسان العصر کی یادگار قائم کی جائے۔ آپ کا کیا خیال ہے۔ حضرت عزیز[۲] مدظلہٗ اس خیال سے متفق ہیں اور سید جالب بھی۔ حضرت کی لائف بجائے خواجہ حسن نظامی کے اگر آپ لکھتے تو بہتر تھا۔ خدا کرے کہ آپ بشاش و تندرست ہوں۔

شکستہ دل جوشؔ ملیح آبادی۔ لکھنؤ

(۲)

۹ جون ۱۹۲۳ء

حضرت ماجد گرامی منش، مَیں جن پریشانیوں میں ہوں، اُن کی شرح نہیں کر سکتا۔ والدِ مغفور جائداد کو قرض کے بوجھ سے کچلا ہوا چھوڑ گئے ہیں۔ کُل بار چالیس ہزار سے کچھ اُوپر تھا، اب بیس ہزار رہ گیا ہے۔ یعنی نصف ادا کر دیا گیا لیکن اب جو رہ گیا ہے وہ کسی طرح سے جنبش نہیں کرتا۔ جتنی میری آمدنی ہے اتنا تو صرف سُود ہوتا ہے، اصل کیوں کر ادا ہو۔ ناچار یہ فیصلہ کیا ہے کہ کوئی حصہ فروخت کر کے قرض ادا کر دیا جائے۔ سوا اس کی کوئی ایسی صورت نکلتی معلوم نہیں ہوتی۔ لوگ مقروض سمجھ کے قیمت اس

قدر کم لگاتے ہیں کہ اس سے قرض ادا نہیں ہوسکتا۔ اب میں کیا کروں؟ یہ ایک سوال ہے جو آج کل میری رگوں میں دوڑ رہا ہے اور اپنا کوئی تشفی بخش جواب نہ پاکر اعصاب میں تشنج پیدا کر رہا ہے۔ کوئی بات جس سے اچھی طرح تسکین ہو سکے، سمجھ میں نہیں آتی۔

اگر سردست کوئی صورت ادائے قرض کی نہیں نکلتی تو کم از کم میں یہ کروں کہ اپنے اخراجات کا بار اپنی جائداد سے اُٹھاؤں اور جو کچھ آمدنی ہے اُسے ہر سال بینک میں جھونکتا جاؤں۔ یہ ایک اچھی صورت معلوم ہوتی ہے، مگر جائداد کو اپنے بار سے سبکدوش کروں تو کیوں کر؟ نہ صنعت آتی ہے نہ حرفت، نہ تجارت کی طرف میلان ہے، نہ ملازمت کی اُمید۔ غرض عجیب کش مکش میں ہوں۔ ع

میں زمیں کے پیٹ کا بوجھ ہوں میں فلک کے دل کا غبار ہوں

اگر آپ کوئی مشورہ یا مدد دے سکتے ہیں تو دریغ نہ کیجیے گا۔ ان تمام آلام کا میرے دماغ پر اس قدر بُرا اثر ہے کہ مجھے ہر رات کو یہ خدشہ ہوتا ہے کہ آج صبح میں دیوانہ ہو جاؤں گا۔

۹-۱ رائڈ اسٹریٹ، کلکتہ

نیاز مند
شبیر حسن جوشؔ

(۳)

۲۸ رجولائی ۱۹۲۳ء

مخلصی، تسلیم — آپ کے محبت نامے کا جواب ۲۸ رجولائی کو لکھ رہا ہوں۔ یعنی کچھ اوپر ایک ماہ بعد۔ کیا عرض کروں، کن شکنجوں میں گرفتار ہوں۔ کلکتہ سے واپسی پر بھی دریاآباد نہ اُٹھ سکا۔

مسٹر برنؔ کے نام تعارف نامہ لکھ کر مجھے روانہ فرما دیجیے۔ میں یا تو..... کے ساتھ وہ خط انھیں بھیج دوں گا، یا خود چلا جاؤں گا، اگر وہ کہیں نزدیک ہوں گے۔ اگر وہ نواب صاحب رام پور سے کچھ تحریک کر سکیں تو بہت اچھی صورت ہے۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ نواب

صاحب، رام پور کے پر دادا کو حضرت گویا نے جو میرے پر دادا تھے، اسّی ہزار روپیہ قرض دیا تھا۔ ایک زمانہ یہ ہے کہ میں اُن کی مدد کا محتاج ہوں۔ میری جائداد ایک لاکھ روپے کی ہے اور قرض بیس ہزار ہے۔ اگر نواب صاحب رام پور یا کوئی اور صاحب بیس ہزار روپے بلا سُود قرض دے دیں تو کوئی خطرے کی بات نہیں۔ میں اپنی تمام جائداد مکفول کرنے پر آمادہ ہوں۔ ہاں اتنی رعایت ضرور چاہتا ہوں کہ اقساط ہلکے ہوں۔ مذہبی صورت میں جو تدبیریں آپ نے بتائی ہیں اُن پر بھی انشاءاللہ عمل کروں گا۔ خدا مجھے توفیق دے۔

آپ کے بھائی صاحب ڈپٹی کمشنر کی کوٹھی پر ملے تھے، اُن سے معلوم ہوا کہ آپ ایک ہفتے کے بعد لکھنؤ آئیں گے۔ آئیے گا تو مجھے بلا بھیجیے گا۔

"رُوحِ ادب" کی اکثر نظموں وغیرہ کا ترجمہ مرزا جعفر علی صاحب بی۔اے ڈپٹی کلکٹر الہ آباد نے کیا ہے۔ لکھنؤ آئیے گا تو دکھاؤں گا ورنہ دریاآباد بھیج دوں گا۔

کلکتہ ڈاکٹر ٹیگور سے ملنے گیا تھا، ملاقات ہوئی۔ اُن کی خواہش ہے کہ میں شانتی نکیتن ہی میں قیام کروں اور سنسکرت وغیرہ کی تعلیم حاصل کروں۔ میں بھی اس پر آمادہ ہو گیا ہوں، کچھ سامان بھی وہاں چھوڑ آیا ہوں۔

افسوس کہ اب تک "پیامِ مشرق" کا کوئی شعر میری نظر سے نہیں گزرا۔ میں نہایت مشتاق ہوں کہ کہاں سے منگاؤں۔ بے شک اقبال کے متعلق آپ کا خیال حرف بحرف درست ہے۔ اُس کی نظر اس چیز کو دیکھ رہی ہے جو خالص اور ٹھوس ہے۔ ادھر آپ کی کچھ نظمیں نظر سے گزریں جنھوں نے آپ کی محبت کے شعلے کو دل میں اور بھی تیز کر دیا۔

لو نامِ خدا شعر بھی کرنے لگے موزوں
اب بچ نہیں سکتا کوئی پہلو مرے دل کا

ملیح آباد۔ لکھنؤ　　　　　　　　　　نیاز مند　جوشؔ

(۴)

۳۰ اگست ۱۹۲۳ء

مکرمی تسلیم ـــ کوئی بیس روز ہوئے ہوں گے، ایک خط روانہ کر چکا ہوں۔

جواب ابھی تک نہیں آیا۔ شاید آپ وطن میں موجود نہیں ہیں۔

میری پریشانیاں روز بروز روبہ ترقی ہیں سُود ہر لمحے بڑھتا ہے۔ میں نے جیسا آپ کو اپنے پہلے خط میں لکھا تھا۔ آپ برن صاحب کے نام تعارف نامہ جلد لکھ دیں۔ خط کا مضمون موثر ہو تا کہ ان کے جذبات پر براہِ راست اثر پڑے۔ میں آپ کا خط لے کر اُن سے ملوں گا۔

آپ زمانہ ہوا لکھنؤ نہیں آئے۔ ملاقات کو جی چاہتا ہے۔ کیا صورت نکالوں؟ بہت دِنوں سے کچھ کہا ہی نہیں ہے۔ انتشارِ طبع کی کوئی حد نہیں۔

خدا کرے آپ اچھے ہوں۔

آپ کا نیاز مند
شبیر حسین جوش
ملیح آباد، لکھنؤ

اقبال کی نظم "پیام مشرق" کہاں سے دستیاب ہوسکتی ہے؟

(۵)

۷؍دسمبر ۱۹۲۳ء

میرے محسن حضرتِ ماجد۔ شکریے میں اگر تکلف اور اجنبیت کی بو نہ ہوتی تو مَیں اُس تعارف نامے کا بے حد شکریہ ادا کرتا، جو آپ نے برن صاحب کے نام مجھے بھیجا ہے۔ میں پرسوں اُن سے مِلا۔ وہ مجھ سے بکمال محبت پیش آئے اور تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک بات چیت ہوتی رہی۔ پرسوں پھر بلایا ہے۔ ابھی کوئی تذکرہ اس معاملے کے متعلق نہ کروں گا۔

اقبال نے لکھا ہے کہ حیدر آباد میں تین صاحبوں کو میرے واسطے لکھ سکتے ہیں۔ مہاراجہ کشن پرشاد، مسٹر حیدری اور راس مسعود، ساتھ میں یہ خواہش بھی کی ہے کہ ماجد صاحب سے مشورہ کرکے میں انھیں لکھوں۔ اب آپ کیا فرماتے ہیں؟

حسن نظامی کو بھی میں نے خط لکھا ہے۔ آپ بھی لکھیں۔

بھوپال کی تحریک کا کیا اثر ہوا؟ آپ لکھنؤ آتے اور مجھے اطلاع نہ دی اِس

کا افسوس ہے۔ اس دَوران میں کیا عرض کروں کس عالم میں رہا، جس کی شرح انسان کے بس کی بات نہیں اور اب بھی اسی عالم میں ہوں۔

نوائے رازِ فرقت ہے وجودِ مضمحل میرا
دھڑکتا ہے مری آنکھوں کے ویرانے میں دل میرا

موت کا طالب
جوشؔ
ملیح آباد، لکھنؤ

(۶)

۲۰ر جنوری ۱۹۲۴ء

مخلصی۔ تسلیم۔ اقبال کے خط آ گئے۔ ایک حضرت کشن پرشاد کے نام۔ دوسرا مسٹر حیدری کے نام۔

اب کن خطوط کی ضرورت ہے؟ مسٹر برن سے دو مرتبہ ملاقات ہو چکی ہے۔ اب کہوں یا نہ کہوں؟ حیدر آباد جانے سے قبل میں چاہتا ہوں انھیں بھی دیکھ لوں۔ اس مقصد کے واسطے آپ خود اگر مل کر برن صاحب سے کہیں تو وہ زیادہ مناسب ہوگا۔ کیا آپ ہفتے عشرے میں لکھنؤ آ سکتے ہیں؟

میرا ارادہ تفصیلی مشورت کے واسطے دریا آباد آنے کا ہے۔ آپ اگر نہیں آ سکتے تو مجھے مطلع کریں تاکہ میں جلد آ جاؤں۔ میں پندرہ روز میں حیدر آباد کا قصد کر رہا ہوں۔

طبیعت بہت افسردہ ہے۔ زیادہ لکھا نہیں جاتا۔ پروردگارِ عالم کا شکر ہے۔ جب مَیں ان افکار میں اپنے کو پاتا ہوں تو چونک کہ یہ حالتیں میری فطرت کے خلاف ہیں، میں رنجیدہ ہو جاتا ہوں اور مجھ پر اس کا دیر تک اثر رہتا ہے۔

آپ کا ممنونِ کرم
جوشؔ ملیح آبادی

(۷)

۳۱ر جنوری ۱۹۲۴ء

گرامی منزلت تسلیم۔ کتاب آپ نے ملاحظہ فرمائی ہوگی۔ مجملاً اس کے متعلق اپنی رائے ظاہر فرمائیے۔

اور جو خطوط آپ دینا چاہتے ہوں براہ کرم جلد روانہ فرمادیں۔ میں عنقریب روانہ ہوں گا۔ حیدری صاحب کو فرانزور دار خط تحریر فرمائیے گا۔

ہاں برن صاحب کے نام اگر زحمت نہ ہو تو آپ ہی خط لکھ کر مجھے روانہ فرمادیں۔ میں یہاں ٹائپ کرالوں۔

خدائے برتر آپ کو آپ کی شرافتِ نفس کا اجر دے۔ کیا خواجہ صاحب سے آپ کوئی تحریر نہیں منگا سکتے۔

نیازمند
جوش
ملیح آباد، لکھنؤ

(۸)

۱۵ر فروری ۱۹۲۴ء

میرے سچے کرم گستر حضرت ماجد۔ مخلصانہ تسلیم قبول کیجیے۔

گرامی نامے پہنچے۔ شکریہ فضول ہے، بلکہ مضر بھی۔ اس لیے کہ اس سے ان لطیف احساسات کو صدمہ پہنچتا ہے جو ایسے مواقع پر دل میں پیدا ہوتے ہیں۔

میں تو یہی مناسب سمجھتا ہوں کہ جو خطوط آپ دکن بھیجنے والے ہیں وہ بھی میرے ہی پاس کر روانہ کیجیے۔ حیدری صاحب کے نام خط ضرور ہو۔ خواجہ صاحب کو میں آج خط لکھ رہا ہوں۔ فرصت ہو تو آج ہی آپ بھی لکھ دیجیے میں ایک ہفتے کے اندر چلا جاؤں گا۔

مرہونِ منت جوش ملیح آباد۔ لکھنؤ

(۹)

۱۲ر مارچ ۱۹۲۴ء

میرے سچے کرم فرما۔ حضرتِ ماجد۔ تسلیم قبول فرمائیں۔

مجھے یہاں آئے ہوئے ایک ہفتے سے زیادہ ہو گئے (کذا)۔

حیدری صاحب بے شک راست باز اور ہمدرد آدمی ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ وہ میرے واسطے ضرور سعی کریں گے۔

رائے یہ قرار پائی ہے کہ دکن کے دو صد سالہ آزادی کے واقعات شروع سے شاہنامے کے طرز پر نظم کیے جائیں۔ سرِدست حیدری صاحب نے کہا ہے کہ کسی ایک واقعہ کو نظم کر لیا جائے اور نظام کو نمونتاً سُنایا جائے کہ میں اس طرز سے کام کرنا چاہتا ہوں۔

اختر مینائی صاحب بلطف و مدارات بپیش آئے۔ جلیل صاحب سے بھی ملاقات ہوئی۔ امین الحسینی صاحب نے محبت کا اظہار کیا۔ مَیں ان سب حضرات کا ممنون ہوں۔

یہاں کی آب و ہوا میں عجیب بات یہ ہے کہ تمام قوائے ظاہری و باطنی پر ہر وقت اضمحلال طاری رہتا ہے۔ کسی وقت طبیعت شگفتہ نہیں ہوتی۔ اگر نظم پر اس قدر قدرت پہلے سے حاصل نہ ہو چکی ہوتی تو یہاں پہنچ کر ایک مصرع بھی نہ لکھا جاتا۔ خط لکھ رہا ہوں اور طبیعت بے چین ہوئی جاتی ہے۔ ہر وقت جی چاہتا ہے لیٹے رہیے۔

حیدری صاحب نے یہاں ملاقات میں مجھ سے یہ بھی کہا تھا کہ یہاں گیسٹ ہاؤس میں میرے واسطے بندوبست کرا دیا تھا، مگر بمبئی جانے کے سبب سے جلد جواب نہ دے سکے۔ مَیں نے سرِدست ایک مکان کرائے پر لے لیا ہے۔ مرزا محمد ہادی صاحب کے پڑوس میں۔ مکان تو خیر معمولی ہے مگر یہ خوبی ضرور ہے کہ ہر طرف خاموشی اور سکوت ہے۔ ایک گاڑی بھی طے کر لی ہے۔ اگر دن بھر استعمال میں رہے تو چھ روپے اور نصف دن کے واسطے ہے۔ گاڑی عمدہ اور شان دار ہے۔

یہ مولوی عبدالباری صاحب ندوی جو یہاں ہیں۔ کیا ہی صاحب ہیں جن سے آپ کے مکان پر لکھنؤ میں دو مرتبہ ملاقات کی نوبت آئی تھی۔ آج اُن سے حبیب الرحمان خاں کے وہاں ملاقات ہوئی۔

شیروانی صاحب سے بھی ملا — خوش اخلاق اور ہمدرد تو ضرور ہیں مگر انتہائی زہد و تقویٰ چہرے پر جو خشکی پیدا کر دیتے ہیں۔ وہ چہرے پر موجود ہے۔ گو خفیف ہے۔ آپ کا مرہونِ کرم

شبیر حسن جوش

باغ مُرلی دھر، ترپ بازار بوساطت مرزا ہادی صاحب۔ حیدرآباد دکن

۱۴۔ مارچ ۲۴ء حیدرآباد دکن (۱۰)

میرے کرم گستر حضرت ماجد۔ پروردگارِ عالم آپ کو خوش رکھے اور اپنی محبت کے درد سے آپ کے دل کو لبریز کردے۔

شاید کل ہی ایک خط لکھ چکا ہوں۔ اِس وقت مولوی عبدالباری صاحب ندوی کے پاس سے آرہا ہوں۔ ان کی رائے ہے کہ آپ میرے متعلق امین جنگؒ صاحب کو ایک خط لکھیں اور زور دار خط لکھیں۔ بلکہ وہ اس بات پر تعجب کرتے ہیں کہ آپ نے شروع ہی میں کیوں اُن کے نام خط نہیں لکھا۔ ممکن ہے اس کی کوئی خاص وجہ ہو۔ شاید ان کی طبیعت پہ نگاہ کرکے آپ نے مناسب نہ سمجھا ہوگا۔ لیکن باوجود ان باتوں کے بھی آپ خط لکھیے۔ بہرحال کوئی نقصان کی شکل تو پیدا ہو نہیں سکتی۔

اور جیسا کہ میں نے پہلے خط میں لکھا ہے کہ براہِ کرم حیدری صاحب کو براہِ راست خط لکھ کر دریافت فرمائیے کہ انھوں نے میرے بارے میں کیا صورت تجویز کی ہے۔ اس پر بھی جلد توجہ کیجیے۔ اگر آپ اس میں تھوڑی زیادتی ہی کیوں نہ خیال کرتے ہوں۔

میں ہوں آپ کا رہینِ منت
شبیر حسن جوش

از: باغ مُرلی دھر، ترپ بازار، بوساطت مرزا محمد ہادی صاحب

۱۲۔ مارچ ۱۹۲۴ء (۱۱)

میرے خالص کرم گستر
گرامی نامہ شرفِ صدور لایا

بہتر ہے حیدری صاحب کو اب آپ کچھ نہ لکھیں اور سر امین جنگ بہادر کے نام تعارف نامہ لکھ کر روانہ فرمادیں۔ نظم پرسوں تیار ہوجائے گی۔

کیا آپ کے ہم نام بدایوں میں ہیں؟

میری طبیعت اب ایک گونہ رُو بہ اصلاح ہے۔ باقی کوئی خاص بات

قابلِ ذکر نہیں۔

نیاز مند
شبیر حسن جوشؔ

باغ مُرلی دَھر، ترُپ بازار، حیدر آباد، دکن
عبدالباری صاحب سے اکثر ملاقات ہوتی رہتی ہے۔

(۱۲)

نیوگسٹ ہاؤس
حیدر آباد، دکن

۲۳ر جون ۲۴ ۱۹ء

میرے حقیقی کرم گستر۔ وقت تنگ، فرصت عنقا۔
اگر آپ جامعہ عثمانیہ دکن کے واسطے مجھے اردو پروفیسری کے ہر طرح اہل سمجھتے ہیں تو براہِ کرم جلد سے جلد چند سطور میں جواب دے کر مجھے ممنون ہونے کا موقع دیں۔ کونسل کا اجلاس سر پر ہے۔
یہ پرچہ میری فائل میں ترتیب دینے کے لیے واپس فرمادیجیے گا۔

نیاز مند
جوشؔ

(۱۳)

.... گوشہ محل

حیدر آباد دکن ۳ر مئی ۱۹۲۵ء غالباً

مخلص و مشفقی۔ قاعدہ ہے کہ غریب الوطنی میں جب آدمی بیمار ہوتا ہے تو اُسے اپنے رفیق یاد آتے ہیں۔ یہی حال آج کل میرا ہے۔ بخار میں مبتلا ہوں۔ بار بار آپ یاد آرہے ہیں۔
میری خاموشی سے آپ ہرگز بدگمان نہ ہوا کریں۔ مجھ پر حیدر آباد کا اثر انشاء اللہ

پڑھ ہی نہیں سکتا۔

ہٹا دے حق سے جو ہم کو وہ بیماری نہیں ہوتی
کبھی دنیا ہمارے قلب پر طاری نہیں ہوتی

آپ کا ممنونِ کرم
جوشؔ

اب شدّتِ ضعف سے لکھا نہیں جاتا۔ سخت بخار ہے۔ جواب جلد دیجئے۔
(۳ مئی ۲۵ سنہ غالباً)

(۱۴)

شعبۂ تالیف و ترجمہ جامعۂ عثمانیہ سرکارِ عالی
حیدر آباد دکن

مورخہ ۵ اردی بہشت ۱۳۴۲ ف

برادرِ محترم۔ آج صدیوں کے بعد آپ کا خط دیکھ کر مجھے متعجب ہونا چاہیے تھا، لیکن یقین فرمائیے کہ مجھے ذرّہ برابر بھی تعجب نہیں ہوا۔ آپ مسلسل کئی روز سے یاد آ رہے تھے اور ہر روز ایسا لگتا تھا کہ آپ کا خط آ گیا۔ بھائی صاحب یہ ہیں رُوحانی کرشمے۔ رِند بھی دل رکھتے ہیں، اور جہاں دل سی نعمت موجود ہو، وہاں رُوحانیت نہ ہو گی تو اور کہاں ہو گی؟

مَیں خط نہ لکھنے کے معاملے میں بہت بدنام ہوں۔ میرے حلقۂ احباب میں اس کی عام شکایت ہے لیکن اس سے کبھی یہ دھوکا نہ کھانا چاہیے کہ یہ چیز خلوص کی کمی کی دلیل ہے۔ آپ کو مَیں اکثر یاد کیا کرتا ہوں۔ سیکڑوں خط بھی لکھ چکا ہوں جو اب دل کے "ڈیڈ لیٹر آفس" میں موجود ہیں۔

جی ہاں، نیاز صاحب "دریا بادی" کو "بے نقاب" کر چکنے کے بعد اب "ملیح آبادی" کو "بے نقاب" فرمانے میں مصروف ہیں، لیکن اس کی پرواہ نہ کیجئے۔ اس دنیا کی رَونق اور اس کارخانۂ عالم کی چہل پہل انھیں ہنگاموں سے ہے۔ "بدمعاش" کا وجود اس کرۂ ارضی کی تابانی اور گرمیِ بازار کے لیے اشد ضروری ہے۔ اگر دنیا میں بدمعاش نہ رہے تو اس محفل

کا سنّاٹا ناقابلِ برداشت ہو جائے۔

"نیاز" اس عالمِ کون و فساد کا نفسِ لوّامہ ہے اسے نہ چھیڑیے۔

آپ دریافت فرماتے ہیں "تو وطن کب آئے گا" جواب میں صرف یہ عرض کرتا ہوں "آہ" آپ اِدھر کب تشریف لائیں گے؟ جی چاہتا ہے کہ آپ سے ملوں۔ بہت سے امور میں گفتگو کرنا ہے اور بہت سی باتوں کو سمجھنا ہے۔

ہوش[۱۹] صاحب کے متعلق آپ مجھ سے دریافت فرماتے ہیں۔ ہوش اور جوش کے فرق پر غور فرمائیے۔

آپ کی بھاوج تسلیم عرض کرتی ہیں۔ بچے آداب گزارتے ہیں۔ نیاز مند

جوش

(۱۵)

باڑہ نواب صاحب

ریاست دھولپور

۱۷۔ اکتوبر ۱۹۳۴ء بصد ہزار عجلت

اخی المحترم، براہ کرم اپنے اِس وقت تک کے تمام تصانیف کے ناموں سے مطلع فرمائیے۔

مَیں عنقریب آپ کی خدمت میں تفصیلی خط لکھوں گا۔ اِس وقت فرصت نہیں ہے۔

نیاز مند

جوش

(۱۶)

باڑہ نواب صاحب

ریاست دھولپور

۲۸۔ اکتوبر ۱۹۳۴ء (غالباً)

اخی المحترم۔ میں حیدر آباد سے راجپوتانہ کیوں کر پہنچا[۲۰] یہ داستان حیرت انگیز بھی ہے، مضحکہ خیز بھی۔ تفصیلی حالات تو زبانی عرض کروں گا۔ مختصر یہ ہے کہ میں نے ایک

نظم "غزل گوئی" لکھی تھی، جس میں شاعر کی تعریف یوں کی تھی :

جس کا موضوعِ سخن ہو کل نظامِ کائنات

"نظامِ کائنات" کو "نظامِ دکن" سمجھا گیا اور ظاہر ہے کہ نظامِ دکن کو موضوعِ سخن بنانا کس قدر گستاخی ہے اور یہی وہ گستاخی تھی جس نے سلسلہ ملازمت قطع کر دیا۔ اب آپ سمجھے ؟ ہنسیے بھی اور رو ییے بھی۔

فہرستِ کتب پہنچی۔ براہِ کرم یہ فرمائیں کہ آپ کیا..... کے مرید یا ارادت مند ہیں ؟ اور یہ ارادت و عقیدت مندی کیوں کر اور کیوں ہوئی۔ نیز آپ کے خیالات میں انقلاب کیسے آیا ؟

ملفوظاتِ حضرۃ رومی کا ماخذ کیا ہے اور "تصوفِ اسلام" میں آپ نے تصوف کی حمایت فرمائی ہے یا اس کا ابطال ؟

آج کل آپ کا مستقل قیام کہاں رہتا ہے ؟

میرے سوالات آپ کو عجیب معلوم ہوں گے۔ اور شاید کسی حد تک نامناسب بھی لیکن مجملاً سہی، جواب ضرور دیجیے اور جلد تر۔

خدا کرے آپ مع الخیر ہوں۔ بچے آداب گزارہ ہیں۔

نیاز مند
جوشؔ

(۱۷)

دھول پور
۱۰ اگست ۱۹۳۵ء

مکرمی ۔۔ کارخِ بلند[۲۱] کے نام سے، جیسا کہ رسائل و اخبار سے آپ کو معلوم ہوا ہوگا، میں دہلی سے ایک انقلابی اور معیاری ماہنامہ جاری کرنا چاہتا ہوں۔ مفلس و محکوم ہندوستان میں طبقۂ اعلیٰ کے ادیب و شعرا اس قدر کم ہیں کہ انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں، جن میں ایک آپ کی ذاتِ گرامی بھی ہے۔ چنانچہ اس بنا پر آپ کو ان چند سطور

کے مطالعے کی زحمت دی جاتی ہے۔ اُمید کہ آپ اس تکلیف دہی کو معاف فرمائیں گے۔

مجھ سے زیادہ آپ کو اس کا علم ہوگا کہ ہندوستانی زبان، ہندوستانی ادبیات، ہندوستانی تمدن و تہذیب اور ہندوستانی ذہنیت یا یوں کہیے کہ ہندوستانی رُوح کو اس وقت صحیح رہنمائی اور زبردست انقلاب کی اتنی شدید ضرورت لاحق ہے کہ مُلک کے ہر حسّاس صاحبِ قلم پر یہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے وقت کا ایک معقول حصّہ رسائل و اخبارات کے لیے وقف کر دے۔ تاریخ شاہد ہے کہ اس وقت تک کسی قوم میں کوئی زندگی و بیداری پیدا نہیں ہوئی ہے جب تک اُس کے ادبیات میں عظیم انقلاب رونما نہیں ہوا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ انقلاب کہیں باہر سے نہیں آتا۔ اس ملک کے مشاہیر ہی اُسے پیدا کرتے ہیں۔

اِس نقطۂ نگاہ سے کارخِ بلند کا یہ ایک غیر متزلزل اصول رہے گا کہ اس کے صفحات صرف مشاہیر اکابر ہی کے لیے مختص رہیں گے، یا اس اُبھرے ہوئے جواں قلم طبقہ کو شریک کیا جائے گا جس کے تیور :

ع می تافت ستارۂ بلندی

کے مصداق ہوں۔

یہ بات اچھی طرح ذہن نشین فرما لیجیے کہ آپ کے متصل و مستقل تعاون کے بغیر رسالہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ اگر آپ نے اعتنا نہ فرمایا تو یہ میری انتہائی بدبختی ہوگی کہ جس جماعت کے بل بوتے پر میں یہ ذمہ داری اپنے سر لے رہا ہوں اور جس طبقہ کی ترجمانی کی خاطر میں اپنی باقی زندگی وقف کر دینے کا فیصلہ کر چکا ہوں، وہی میری اعانت نہ کرے۔

آخر میں نہایت خلوص کے ساتھ آپ کی خدمت میں استدعا کی جاتی ہے کہ سرِدست رسالے کے نمونے کے پرچے کو کامیاب بنانے کی خاطر، ازراہِ معاون پروری و اخوتِ ہمعصری پندرہ روز کے اندر اپنا گراں قدر مضمون مرحمت فرما کر شکر گزاری کے احساس کے ساتھ ساتھ مجھے اس طمانیت آمیز مسرت سے بھی لطف اندوز ہونے کا موقع دیجئے کہ میری قوم کے اربابِ جوہر مجھ سے تعاون پر تیار ہیں۔

دوسری درخواست یہ ہے کہ مندرجہ ابواب میں سے براہِ کرم اپنے لیے دو ایک باب مختص فرما کر ہر ماہ ایک مقالہ مرحمت فرماتے رہیے۔ اگر ابواب میں کسی نوع کی ترمیم، تنسیخ یا اضافے کی ضرورت ہو تو ازراہِ عنایت اپنے مشورے سے بہرہ یاب فرمائیے۔ آخر میں یہ بھی عرض کر دوں کہ یہ تحریر ہندوستان کے کروڑوں افراد میں سے صرف چند مخصوص افراد کی خدمت میں روانہ کی جا رہی ہے، اگر مجھے اس باب میں مایوسی ہوئی تو میں نہایت قلق کے ساتھ یہ فیصلہ کر کے اجرائے رسالہ کے خیال ہی کو ترک کر دوں گا کہ ابھی ہندوستان اس نوع کے منصوبوں کے لیے تیار نہیں ہے۔

اس تحریر کے مطالعہ فرمانے کا شکریہ قبول فرمائیے۔

(فہرستِ ابواب پُشت پر)

نیاز مند

جوشؔ

ابواب

(۱) اشارات ..... مختلف نوٹ

(۲) افکار ...... فلسفیانہ اور تحقیقی مضامین، جن میں زیادہ تر حریتِ فکر کا درس دیا جائے۔ روایات و اوہام، تقلید، قدامت پرستی اور تعصبات و تنگ نظری کے خلاف مسلسل جہاد کیا جائے۔ اور دلوں پر یہ نقش کر دیا جائے کہ "انسانیت" نسل، رنگ، وطن اور مذہب سے بالاتر ہے۔

(۳) مقالات....... عام عالمی مضامین اور ایسے تاریخی یا طبع زاد مقالے جو ہندوستانیوں کو زندگی، بیداری، ذہنی ترقی، معاشرتی اصلاح، جسمانی صحت، دماغی علاج اور مردانہ سیرت کا سبق دیں اور خصوصیت کے ساتھ ہندو مسلم اتحاد پر اس قدر زور دیں کہ ان میں ازدواجِ باہمی کی بنیاد پڑ جائے۔

(۴) منتخبات .... غیر زبانوں اور بیرونی رسائل کے تراجم

(۵) ادبیات ..... ادبی مضامین، نظمیں، ڈرامے اور افسانے صحیح ادبیت اور حقیقی شعریت کے معیار پر، نیز صرف وہ غزلیں جو مسلسل ہوں۔

(۶) حیات ونشاط.... خوش باش دمے کہ زندگانی ایں است (نثر و نظم)

(۷) لسانیات..... زبان میں ارتقاء و اصلاح، اجتہاد و وضعِ اصطلاحات، تدوینِ قواعد و لغت اور تصفیۂ مسائلِ ادبی و لسانی۔

(۸) نسائیات .... میانہ روی لیکن شدت پردہ و قدامت پرستی کی شدید مخالفت کے ساتھ۔

(۹) انتقادیات.... کُلیتہً علمی و اَدبی، جدید فنِ تنقید کی روشنی میں

(۱۰) رفتارِ وقت... عصرِ حاضر کے اہم کوائف اور ان پر مختصر، لیکن پُرمغز تبصرے۔

(۱۸)

دھول پور

۵ر اکتوبر ۱۹۳۵ء

اخی محترم اب بچوں کا کیا حال ہے؟ خدا کرے تندرست ہو چکے ہوں۔ میں اوائل نومبر میں پرچہ نکال رہا ہوں۔ نام اب "کلیم" کر دیا ہے۔ "کاخِ بلند" سے احباب ناخوش تھے۔

آپ نے فرمایا تھا، میں جھونپڑی میں رہنے والا کاخِ بلند تک کہاں پہنچ سکتا ہوں۔ لیجئے، کاخِ بلند میں نے ڈھا دیا۔ اب تو کلیمی اختیار کی ہے، اور ظاہر ہے کہ حلقۂ کلیم میں زیادہ تر گلیم پوش جھونپڑے والے ہی آ سکتے ہیں۔

کیا میں توقع کروں کہ آپ ایک ہفتے میں کوئی مختصر سا مقالہ عنایت فرمائیں گے۔ مجھے آپ کے مضمون کی بہت تمنا ہے۔

لکھنے والوں کی کمی نہیں۔ ہر گلی کوچے میں ہزاروں "بی اے آنرز"، "مضمون کا کام" کی آوازیں لگاتے پھرتے ہیں، لیکن کیا آپ کی غیرت یہ گوارا کر سکے گی کہ میں ماجد کا دوست ہو کر ہرزہ نگاروں کے سامنے دستِ سوال دراز کروں۔

آپ کا جوشؔ

(۱۹)

دھول پور

۱۰ر ستمبر ۱۹۳۵ء

بصد ہزار عجلت

مکرمی — اپنے پرچے کے واسطے ایک خط لکھ چکا ہوں۔ جس میں آپ سے مضمون کی درخواست کی گئی تھی۔ ہنوز مضمون کیا، خط کے جواب سے بھی محروم ہوں۔

لکھنے والوں کی کمی نہیں مگر میں غیر معیاری مضامین جمع نہیں کر سکتا۔ یقین فرمائیے، میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں گا اگر آپ علمی یا ادبی مضمون ایک ہفتے کے اندر لکھ کر مجھے روانہ فرما دیں گے۔ اچھے مضامین کی کمی نے مجھے دیوانہ بنا رکھا ہے۔ اگر آپ توجہ نہ کریں گے تو مجھے بہت قلق ہوگا۔ فرصت بہت ہی کم ہے۔ اکتوبر کے پہلے ہفتے میں پرچہ شائع کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے آپ کے بغیر کل نہ آئے گی۔ اُمید کہ آپ مجھے مایوس نہ فرمائیں گے۔

بچے آداب گزار ہیں۔

آپ کا
جوشؔ

اگر آپ کا مضمون نہ آیا تو میں خود دریاباد حاضر ہوں گا۔

(۲۰)

دھول پور

۱۴ر اکتوبر ۱۹۳۵ء

بھائی صاحب، یہ چٹکیوں میں بات کو اُڑا دینا آپ نے کس سے سیکھا ہے، پہلے تو یہ روش نہ تھی۔

میں نے آپ سے مضمون کی فرمائش کی تھی۔ آپ نے سب کچھ تو لکھا لیکن مضمون کی بات بالکل نہ کی۔ کیا آپ اس فریب میں مبتلا ہیں کہ میں اس طرح ٹالنے سے آپ کو چھوڑ دوں گا؟ میں تو کمر ہمت باندھ چکا ہوں کہ ہر ماہ آپ سے ایک مقالہ لکھایا کروں گا۔

دیکھئے ماجد صاحب، آپ ایک ہفتے میں کوئی مقالہ ضرور بھیج دیجیے، ورنہ جب میں نومبر میں

ملوں گا تو آپ خود ہی اندازہ کیجیے کہ میرے شکووں کا لہجہ کس قدر تلخ اور آپ کے زہد کے باب میں کس حد کا طنز آمیز ہوگا اور آپ کو اس درجہ پشیمانی ہوگی کہ میرے ملتے تھے سے پسینہ ٹپکنے لگے گا۔ کیا آپ اس کے لیے طیار ہیں؟ کیا آپ ایک مخلص کی حیثیت سے اس صورت حال کو قابل برداشت تصور کرتے ہیں؟ کیا یہ حقیقت ہے کہ ارباب خیر و صلاح آدمیوں سے محبت کرنا ترک فرما دیتے ہیں؟ میں آپ سے مکرر عرض کرتا ہوں کہ میری التجا کو نہ ٹھکرائیے ورنہ میں کوہ آتش فشاں کی طرح بھڑک اُٹھوں گا۔

کیا آپ اس ہولناک وقت سے پناہ نہیں مانگتے۔

آپ کا
جوش

(۲۱)

کلیم

مدیر: جوش ملیح آبادی

دہلی۔ کارونیشن پرنٹنگ پریس

فتح پوری ۱۴ نومبر ۱۹۳۵ء

کیوں صاحب۔ اب تو آپ نے بوڑھے جوش کو چٹکیوں میں اڑانا شروع کر دیا۔ یہ تیسرا خط ہے کہ آپ اور تو سب کچھ لکھتے ہیں، لیکن "کلیم" میں مضمون لکھنے کے ذکر کو بالکل صاف اُڑا جاتے ہیں۔ اب میں سنجیدہ ہو چلا ہوں۔ سنجیدگی میں ایک حد تک ترشی بھی پیدا ہو چلی ہے۔

کیا آپ "کلیم" کو اس قابل نہیں سمجھتے کہ آپ کا کوئی مقالہ اس میں شائع ہو؟ اگر یہ ہے تو صاف صاف لکھیے، ٹالنے سے کیا فائدہ؟

اور اگر لکھنا چاہتے ہیں لکھیے اور جلد لکھیے۔ دوسرا پرچہ مرتب ہو رہا ہے۔

جواب ذرا جلد دیجیے تاکہ میں آپ کے آخری فیصلے سے جلد مطلع ہو سکوں۔ اور اس کے بعد آپ کے متعلق ٹھنڈے دل سے فیصلہ کر سکوں۔

آپ کا
جوش

(۲۲)

کلیم

دہلی، ۱۸۔ مارچ ۱۹۳۶ء　　　　　　مدیر: جوشؔ ملیح آبادی

بنام قوت دحیات

ماجد میاں۔ اب میں سمجھا کہ آپ نے "کلیم" کے ساتھ اس قدر بے اعتنائی کیوں رُوا رکھی۔ آپ کے انتقاد کا لب و لہجہ پُکار پُکار کر کہہ رہا ہے کہ آپ کا تصوّف مجھ سے نہایت بر افروختہ ہے، اور آپ کی قدامت پسندی کے ماتھے پر شکنیں پڑی ہوئی ہیں۔

جی ہاں، میں ایک اچھا ادیب بن سکتا ہوں۔ اگر "راہِ نجات" کی تفسیر شائع کروں اور "نور نامول" پر مضامین لکھوں۔

واہ رے ہندوستان! بدقسمت ہندوستان!!

کاش آپ کو یہ غور کرنے کا موقع ملے کہ کسی معاملے میں حدود سے متجاوز ہونا کس قدر ہولناک صورتِ حال ہے!

نیاز مند
جوشؔ

(۲۳)

دہلی۔ ۶ اپریل ۱۹۳۷ء　　　　　　کلیم　　　　　　مدیر: جوشؔ ملیح آبادی

یگانۂ بے گانہ نما ــــ میں نظیر نمبر نکالنے والا ہوں۔ کیا آپ مراسمِ قدیم پر نگاہ کرکے میاں نظیر پر کوئی مقالہ تحریر فرما سکیں گے؟

زیادہ کیا لکھوں

گفتگو آئینِ درویشاں بوَد

آپ کا
جوشؔ

(۲۴)

ملیح آباد لکھنؤ
کلیم
مدیر : جوش ملیح آبادی

۱۲ اپریل ۱۹۳۹ء

محترمی ـــ ذہنی طور پر بعید ہو جانے کے باوجود قلبی طور پر میں آپ کو اپنے سے قریب پاتا ہوں، معلوم نہیں، آپ کے دل کا کیا حال ہے؟

اس اثنا میں بار بار آپ سے ملنے کو جی چاہا اور ایک مرتبہ تو دریا گنج کے سفر کی تیاری بھی کر لی، لیکن پھر ٹھہر جانا پڑا۔

اگر طبیعت پر جبر نہ کرنا پڑے تو اب کی جب لکھنؤ آیئے، مجھے دو ایک روز پیشتر اطلاع دے دیجیے، میں آکر مل لوں گا۔

ملیح آباد بھی لکھنؤ سے کچھ اس قدر دُور نہیں ہے۔ لیکن آپ کیوں تشریف لانے لگے۔

مزاج کیسا ہے۔ مشاغل و معمولات کیا ہیں؟

آپ کا
جوش

(۲۵)

طاہر پیلس
شنکر سیٹھ روڈ
پونا ۲۴ اگست ۱۹۴۳ء

محترمی ـــ براہِ کرم مطلع فرمائیے کہ آپ کے نزدیک قرآن کا بہترین ترجمہ کس نے کیا ہے اور وہ کہاں سے مل سکتا ہے؟

عبداللہ یوسف علی کے ترجمے کے باب میں آپ کا کیا خیال ہے؛ قدماء کے ترجموں میں سے آپ کسے پسند فرماتے ہیں اور بہترین تفسیر کون سے ہے؟ (کذا)

سید احمد خاں کی تفسیر کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

اردو، فارسی اور انگریزی میں خدا کے وجود پر عقلی دلائل جن کتابوں میں ہوں مہربانی

فرما کر ان کے ناموں اور ملنے کے پتے سے مطلع فرمائیے۔
کیا امام غزالی یا رازی کی کوئی ایسی تصنیف ہے؟
نیز مسئلہ جبر و قدر پر جو کتابیں آپ کی نظر سے گزری ہوں ان کے نام بھی لکھ بھیجئے شکرگزار ہوں گا۔ اُمید کہ مزاجِ گرامی بخیر ہوگا۔

وہی "تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو"
جوشؔ

(۲۶)

پبلی کیشنز ڈویژن
انفارمیشن اینڈ براڈ کاسٹنگ ڈیپارٹمنٹ
اولڈ سکریٹریٹ، دہلی

محترمی ـــــ "آج کل" کی ادارت کا قرعہ اس دیوانے کے نام پڑا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ آپ کی خدمت میں یہ استدعا کی جا رہی ہے کہ براہِ کرم اس کے واسطے کوئی علمی، ادبی یا سیاسی مقالہ روانہ فرما کر شکریے کا موقع دیجئے۔

وقت تنگ ہے، اس لیے جس قدر جلد آپ کا مقالہ شرفِ صدور لائے گا، اتنا ہی جذبۂ تشکر قوی ہوگا۔

افسوس کہ اس روز میں حاضر نہ ہو سکا۔ ہر چند خود مجھے اس کا بہت قلق ہوا اور اب تک ہے۔ لیکن کچھ ایسی ہی مجبوریاں عناں گیر ہو گئی تھیں۔

مجھے یقین ہے کہ میری یہ تحریر ٹالی نہیں جائے گی کہ حقِ محبتِ دیرینہ داری۔

نیازمند
جوشؔ

(۲۷)

کیسے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی

پبلی کیشنز ڈویژن۔ ۱۷/ جون ۱۹۴۸ء — برائے فوری توجہ

شفیقی۔ والا نامہ صادر ہو کر باعثِ مسرت و ملال ہوا۔ علتِ مسرت تو ظاہر ہے لیکن

وجہِ ملال یہ ہے کہ آپ نے اپنا مقالہ نہیں بھیجا اور یہ تحریر فرمایا کہ میں "آج کل" کی دُنیا سے ناواقف ہوں۔ "آج کل" کی دنیا ان رسائل کی دنیا سے مختلف نہیں، جس میں آپ کے مقالے شائع ہوتے ہیں۔ میں آپ کی تسلّی کی خاطر "آج کل" کے چند پرچے روانہ کر رہا ہوں۔ انھیں ملاحظہ فرمائیے اور "آج کل" کے بازاجرا کی پہلی اشاعت کے واسطے براہِ اخوت کوئی علمی، ادبی، یا حکیمانہ مقالہ جلدتر مرحمت فرمائیے۔ آپ کی اس کرم فرمائی کا نہایت شکرگزار ہوں گا۔

آپ کو جس "جام" کا چسکا پڑا ہے اس کے چند دہکتے قطرے مرحمت فرمائیے۔ میں تو "رندِ ہزار شیوہ" ہوں۔ اُنھیں بھی سر آنکھوں پر جگہ دوں گا۔

گرمی کی شدّت سے اعصاب کا لوہا پگھل پگھل کر بہہ رہا ہے۔ اللہ، برسات کب آئے گی؟

دن بہت انتظار میں گزرے

نیازمند
جوشؔ

(۲۸)

اجی مولانا صاحب ــــ کچھ تو منھ سے بولیے۔ سر سے کھیلئے، آخر ہے کیا، جو آپ اس قدر خاموش ہیں۔ سو بار کہہ چکا ہوں کہ جو اللہ والے ہیں وہ اللہ کے بندوں سے بھی محبت کرتے ہیں۔ LOVE ME LOVE MY DOG ـ لیکن آپ کیسے اللہ والے ہیں، محبت کیسی، خط کا جواب بھی آپ نہیں دیتے۔

کتنی بار عرض کر چکا ہوں آپ کی بارگاہِ پاک میں کہ حضورِ والا کوئی مقالہ مرحمت فرمائیے، لیکن آپ ہیں کہ ٹس سے مس نہیں ہوتے۔

یا تو براہِ کرم مقالہ عنایت فرمائیے یا دلائل کے ساتھ لکھ بھیجئے کہ آپ کبھی اور کسی حالت میں بھی یہ فعل نہیں کریں گے۔

نیازمندِ قدیم۔ ہر چند لئیم
جوشؔ احسن التقویم

عنوانات

(۱) مسئلہ جبر و قدر
(۲) علمِ باری اور افعالِ انسانی کی ذمہ داری
(۳) علمِ کلام اور فلسفہ
(۴) اودھ کا حصہ تہذیب و ثقافت میں
(۵) موازنۂ حافظ و سعدی
(۶) وجودِ باری کے عقلی دلائل
(۷) آلۂ تحقیق و تفکر — عقل ہے کہ وجدان
(۸) نیطشے اور اس کی تعلیم
(۹) ڈوائن کامیڈی یا فاؤسٹ کے نکات
(۱۰) اقبال محض ایک شاعر کی حیثیت سے
(۱۱) اگر دنیا میں ادب نہ ہوتا
(۱۲) دنیا کے چند عظیم ترین معمارانِ فکر

مولانا دریا بادی جو دریادلی سے کام نہیں لیتے۔ اللہ نیکی کی توفیق دے ان نومولوی صاحب کو۔

(۲۹)

۲۳ جون ۱۹۵۰ء آج کل

حضورِ والا — مقالہ پہنچا۔ کہاں تک شکریہ ادا کروں اس کرم گستری کا! آپ کی زندگی جو کچھ ہو سو ہو، لیکن آپ کا قلم ایک رندِ خراباتی ہے — میں اکثر سوچتا ہوں کہ آپ کے طرزِ نگارش کے پودے اور آپ کے ادبی بانکپن کے سبزے کو آپ کی مولویت کے تناور درخت کے سائے تلے پنپنے کی اجازت کیوں کر دے دی۔ یہ اگر خرقِ عادت نہیں تو اور کیا ہے؟

آپ کی سخن سنجی اور ادب نوازی کی کھیتی تقشف و تورع کے زبردست پالا گر

جلنے کے باوصف اب تک لہلہا رہی ہے۔ اگر آپ کے گلستان وجود کو اتنے شدید پالے سے پالا نہ پڑا ہوتا تو نہ جانے آپ کیا ہوتے اور کیا کچھ نہ کرتے۔

جو پری جوگیا چادر میں اس بُری طرح دل موہے لے رہی ہے۔ اگر وہ نام خدا بن ٹھن کے چوتھی کا جوڑا پہن کے سامنے آتی تو اللہ ہی بہتر اندازہ کر سکتا ہے کہ کتنے اربابِ نظر خاک و خون میں غلطیدہ نظر آتے۔

ماجد صاحب! آپ تو، یادش بخیر، ہماری فوج کے کپتان تھے۔ یہ آپ کے جی میں کیا آیا کہ یہاں سے فرار ہو گئے۔ اب تک آپ کی وردی ہمارے مال خانے میں پڑی ہوئی ہے۔

نیاز مند
جوشؔ

اک جانِ حیا رات کو مجھ سے ملنے
یوں آئی جھجکتی ہوئی منھ کو ڈھانپے
دنیا کے کسی فرشتہ سیرت کے خلاف
دل میں آتی ہے بدگمانی جیسے

اس سانولی مُطربہ کی اللہ رے شان
گھُل جاتی ہے چہرے کی نمک میں ہر تان
یوں راگ دمک رہا ہے اُس کے منھ پہ
سونے کے ہوں جس طرح کسوٹی پہ نشان

پھولوں سے معطّر ہے خرابات کی رات
اے جانِ جہاں ٹھہر بھی جا آج کی رات
ان تیرہ گھٹاؤں میں کہاں جائے گی
شانوں پہ لیے ہوئے یہ برسات کی رات

آہستہ ندی گزر رہی ہے گویا
کاکل کھُل کر بکھر رہی ہے گویا
آنکھیں تری جھک رہی ہیں تجھ سے مل کر
دیوار سے دھوپ اُتر رہی ہے گویا

جنگل کی پری بگڑ رہی ہے گویا
بدلی سے ہوا جھگڑ رہی ہے گویا
یوں دوش پہ اُڑ رہی ہیں اُن کی زلفیں
تاریک پھوار پڑ رہی ہے گویا

یہ سلسلہ لامتناہی ہے کہ زُلف
گہوارہ بادِ صبحگاہی ہے کہ زُلف
اے مستِ شباب دوشِ سیمیں پہ ترے
ڈھلکی ہوئی رات کی سیاہی ہے کہ زلف

(۳۰)

ماہنامہ شعلہ و شبنم
دہلی، ۲۸ جولائی ۱۹۵۰ء

محترمی — یاد آوری کا شکریہ۔ اسلامک لٹریچر ابھی تک موصول نہیں ہوا ہے۔ میں بھی ڈاک کے محکمے سے استفسار و احتساب کروں گا، آپ بھی کریں۔
امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

نیاز مند
جوشؔ

(اس کے بعد خطوط کی ایک نامعلوم تعداد میری دسترس سے باہر رہی۔ جو جواہر پارے مل گئے، حاضر ہیں۔) (مرتب)

(۳۱)

کراچی

۵ اگست ۱۹۶۳ء

برادرِ محترم ـــــ آپ نے یاد کیا، دل شاد کیا۔ قوّت و حیات آپ کو سلامت رکھے۔
کیوں کر آپ کو اس امر کا یقین دلاؤں کہ میں اثنائے قیامِ ہندوستان میں آپ کے دیدار کو کس قدر تڑپتا رہا۔ لیکن ذہنی و مادّی مسائل کا اس قدر ہجوم رہا کہ شدید آرزوئے ملاقات کے باوصف نہ تو آپ تک پہنچ اور نہ ہی آپ کو زحمت دے سکا۔
اب کی جاڑوں میں آیا تو آپ سے ملے بغیر واپسی کا ارتکاب نہیں کروں گا۔ رہیں وہ خبریں جو میرے باب میں اُڑائی یا یوں کہیے کہ اختراع کی جارہی ہیں۔ تمام تر بے بنیاد اور یاروں کی ایجاد ہیں میں یہیں رہوں اور یہیں مروں گا۔
میری یہ بڑی بدبختی ہے اور اس بدبختی پر میں اپنے عناصرِ ترکیبی کا شُکر گزار ہوں کہ جس بات کو اپنے نزدیک حق سمجھتا ہوں، اُس کا دھڑلّے کے ساتھ، زبان و قلم سے اعلان کر دیتا ہوں اور اسی پیدائشی عادت کی بنا پر، ہند و پاک، دونوں ملکوں میں وہ ہوں جس کو مغضوب، مبغوض، مقہور، معتوب اور مردود کہا جاتا ہے۔
میں یہ دعویٰ نہیں کر سکتا، یا بالفاظِ دیگر میری یہ مجال نہیں کہ میں اس قدر مہمل دعویٰ کروں کہ جو کچھ میں نے سمجھا، بُوجھا یا سوچا ہے، وہی حق ہے اور ایسا حق کہ اُسے باطل قرار ہی نہیں دیا جا سکتا لیکن میں بے پایاں دیانت کے ساتھ یہ دعویٰ ضرور کر سکتا ہوں کہ میری نیت (برقرار) ہے اور میرے نفس کی طہارت پر کوئی شُبہ نہیں کیا جا سکتا۔
لیکن لوگ سطح بیں ہونے کے باعث میری نیت پر نگاہ نہیں کرتے اور میرے الفاظ کی سختی و شوخی پر (جو، اب بہت کم ہو چکی ہے) نگاہ کر کے مجھ پر سب و شتم کرنے لگتے ہیں۔

مجھ کو انعامِ حق پناہی دے گا
میری نیت کو تاجِ شاہی دے گا

میرے سینے میں انبیا، کا دل ہے
اللہ سے پوچھو وہ گواہی دے گا

آپ کا چاہنے والا
جوش مرحوم

(۳۲)

شاہ نجف روڈ
لکھنؤ شریف
۸ ستمبر ۱۹۶۷ء۔
صبح، چار بج ۱۴ منٹ

الاخی العزیز، یہاں آتے آتے بقولِ عوام ایسے بھبھڑ میں گھر گیا ہوں کہ آپ کو خط نہ لکھ سکا۔ ناچار ماضی کے "کامریڈ" رضا انصاری اور حال کے "مفتی" مولانا رضا سے کہہ دیا کہ وہ آپ کو خط لکھ دیں (رونا آتا ہے رضا کے ارتداد پر)

آج ہی رات کو دلی جا رہا ہوں۔ پندرہ بیس روز میں پلٹ کر آؤں گا تو دریاباد پہنچوں، یا آپ کو بلاؤں گا

ہائے ماجد صاحب، میرا لکھنؤ اُجڑ گیا۔ سارے جانے پہچانے چہرے مٹی میں مل گئے۔ ہائے اب وہ یار ہیں نہ وہ گیسو و رخسار ۔۔۔ چوک کے چھجے ویران پڑے ہیں جہاں سے کل زلفوں کی بدلیاں برسا کرتی تھیں، اب داڑھیوں کا عذاب نازل ہو رہا ہے۔

آسماں را حق بود، گر خوں ببارد بر زمیں

ملیح آباد گیا تو یہی اداسی دیکھی، دادا میاں کا محل بھائیں بھائیں کر رہا ہے۔ باپ کی ڈیوڑھی سنسان پڑی ہے۔ نہ وہ دو دو بجے رات تک خدمت گاروں کی "حقہ لاؤ، پان لاؤ" کی آوازیں ہیں۔ نہ چلبداروں کی ڈفلیاں، نہ مصاحبوں کا ہجوم۔ جی بیٹھتا ہے ان سب باتوں کو دیکھ دیکھ کر ۔۔۔ چغد نوبت می زند بر گنبدِ افراسیاب!

اب آپ کی صحت کیسی رہتی ہے۔ کم سے کم میرے انتقال فرما جانے تک تو ضرور زندہ رہیے اب مجھ میں یاروں کے داغ اُٹھانے کی ہمّت نہیں رہی ہے۔ پُرانے رفیقوں میں اب یا آپ ہیں یا حکیم خواجہ شمس[۲۲] الدّین۔ دونوں کو وہ چیز کھا چکی ہے جس کو خدا ناشناس مسلمان خوفِ خدا کہتے ہیں۔ انھیں کون سمجھائے کہ حکیم و عادل سے جو شخص ڈرتا ہے، وہ اس کی حکمت اور عدالت دونوں سے انکار کا ارتکاب کرتا ہے۔

آپ کو تو بہت دن سے دیکھا نہیں۔ شمس الدّین سے کوئی ایک ہفتہ ہوا ملا تھا۔ اس کی صورت اب دیکھی نہیں جاتی۔ گالوں میں تقشف کے مٹیالے گڑھے پڑے ہوئے ہیں اور داڑھی کے بال سفید رُخساروں پر کھڑے اذان دے رہے ہیں۔ سچ ہے: اللہ کی لاٹھی میں آواز نہیں ہوتی۔

آپ کا دل سے چاہنے، اور آپ پر
آپ پر دل سے ترس کھانے والا
جوشؔ، مرحوم و مغفور

۱۳۸۔ ڈی۔ فیڈرل ایریا بی
(۵)
کراچی
(۳۸)
۲۶/ اکتوبر ۱۹۶۶ء

شیخ منظور الٰہی

بندہ پرور۔ مجھے آپ کی خدمت میں نیاز حاصل نہیں۔ لیکن آپ کی فضیلت و شرافت کو زبانِ خلق پر جاری دیکھ کر، آپ کو یہ چند سطریں لکھ رہا ہوں۔

ترقی اردو بورڈ کراچی کی حالت بہت ابتر ہے، تدوینِ لغت کا کام غلط راستے پر مُڑ چکا ہے اور حالات اس قدر بگڑ چکے ہیں کہ اُن سے کسی خیر کی اُمید وابستہ نہیں کی جا سکتی۔

چوں کہ مجھے اُردو زبان سے محبت اور بادرجۂ عشق محبت ہے، اور اُسی کے ساتھ ساتھ چوں کہ میں نے ہی، تین چار برس کی عرق ریزی کے بعد، اس دفتر کی بنیاد ڈالی تھی، اس بنا پر، یہ ایک فطری امر ہے کہ مجھے ترقی اُردو بورڈ کو، نزع کی حالت میں دیکھ کر بے حد قلق ہوتا ہے۔

چوں کہ مجھ کو بورڈ سے علیحدہ کر دیا گیا ہے، اس لیے آپ کے دل میں یہ بدگمانی پیدا ہو سکتی ہے کہ میں یہ سب کچھ، اپنے ذاتی جذبات سے مغلوب ہو کر، لکھ رہا ہوں اور چاہتا ہوں کہ مجھے دوبارہ ملازمت مل جائے۔

اِس غلط فہمی کے ازالے کی خاطر، میں نہایت ذہنی دیانت کے ساتھ، بڑے روشن الفاظ میں، آپ کو یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں اَب عُمر کی اس منزل میں آ چکا ہوں، جب نوکری یا کسی اور مالی منفعت کے تمام تصوّرات سے آدمی دست بردار ہو جاتا ہے۔

اس لیے اب نہ مجھے ملازمت ہی کی تمنا ہے، نہ آسائشِ زندگی ہی کی آرزو۔

میں تو صرف اس قدر چاہتا ہوں کہ ترقی اُردو بورڈ کی حالت سنبھل جائے، لغت کی بالحسن الوجوہ، تکمیل ہو جائے، اور جس کام کی میں نے بنیاد ڈالی تھی، وہ دَم نہ توڑ دے۔

اُمید کہ مزاجِ گرامی، بہمہ وجوہ، مع الخیر ہوگا۔

نیاز مند
جوش ملیح آبادی

وہ جوش جو، اب زمین اور آسمان دونوں
سے بے نیاز ہو چکا ہے۔

(۲)

۱۳۸ - ڈی۔
فیڈرل ایریا - بی
کراچی ۳۸
۷/۲/۱۹
صبح ۱/۲ ۲ بجے

بندہ نواز، گرامی نامے اور مسوّدات کے سلسلے میں کرم فرمائی کا رسمی نہیں، دلی شکریہ قبول فرمائیے۔

جی ہاں، میں جانتا ہوں کہ میری ناکام زندگی، ان مسوّدوں کو فروخت کر رہی ہے اور اسی بناء پر حقیر معاوضہ ملے گا، اگر میری مبارک موت ان کو فروخت کرتی تو، منھ مانگے دام پاتی۔

لیکن، جب، زمانے کی ناقدردانی، اپنے اس دَورِ واپسیں کی سوختہ سامانی اور اُن ذہنی تعصّبات پر نگاہ کرتا ہوں، جو میری ذات سے وابستہ ہیں تو آپ کا پیدا کردہ یہ سہارا بھی بہت غنیمت معلوم ہوتا ہے اور بے ساختہ جی چاہتا ہے کہ آپ کا شکریہ ادا کروں۔

اب اپنے دل کی ایک بات بھی آپ سے کہہ دوں۔ یعنی آپ کی پہلی ملاقات نے،

میرے دل پر، آپ کی شرافت ذاتی و نسلی کا اس قدر سکّہ بٹھا دیا، اور آپ کی قدردانیِ علم و ادب کا وہ نقش قائم کر دیا ہے کہ اگر آپ میرا کام نہ بھی کرتے، پھر بھی آپ کی نجابتِ نفس کے متعلق میری رائے میں ذرّہ برابر بھی تزلزل نہ ہوتا، اور میں یہ فیصلہ کر کے مطمئن ہو جاتا کہ میری ناکامی آپ کی سرد مہری کا نہیں، نامساعد حالات کا لازمی نتیجہ ہے۔

اَب رہا یہ امر کہ مَیں "جیتے جی" اپنے کو مرحوم کیوں لکھتا ہوں، سو یہ داستان بڑی دردناک ہے۔

گفتگو آئینِ درویشی نہ بُود
ورنہ با تو، ماجراہا، داشتیم!

مَیں ہوں آپ کا رہینِ منّت
مرحوم جوشؔ

(۱)

طاہر پیلس، شنکر سیٹھ روڈ، پونا (۲)

۲۸ ر اپریل ۱۹۴۶ء

عزیزی بنّے، حاملِ رقعہ حضرت نادمؔ صاحب سیتاپوری کے تعلقات آپ کے خاندان سے بہت دیرینہ ہیں۔

نادم صاحب ! :

شرمندہ ہوں میں اپنے کمالوں کے سامنے

کی قسم کے انسان ہیں، جو نہایت اچھے ادیب و شاعر ہیں لیکن جنھیں خودداری اُبھرنے نہیں دیتی۔ آپ کو زیادہ لکھنا آپ کے خلوص سے بدگمانی رکھنے کے برابر ہے۔ مختصر یہ کہ جہاں تک ہوسکے نادم صاحب کی امداد کیجیے، جس کے واسطے میں ہرگز شکرگزار نہیں ہوں گا۔ اس لیے کہ یہ امر آپ کے فرائض میں داخل ہے۔

مناسب ہو تو آپ خواجہ احمد عباس سے بھی ملیے۔ انھیں میرا خط دکھایئے اور میری طرف سے کہیے کہ وہ نادم صاحب کا ہر صورت سے ہاتھ بٹائیں۔ جس کے واسطے میں اُن کا بھی ہرگز شکرگزار نہیں ہوں گا کہ آپ کی طرح اُن کا بھی یہی فرض ہے۔

جوشؔ

(١)

٢٧ جون ١٩٦٧ء

محترمی، حاملِ رقعہ سخاوت[1] میرزا صاحب ایک بلند پایہ اربابِ علم میں سے ہیں۔ لیکن روزگار کے ستائے ہوئے ہیں۔

آپ عزیزی مشفق خواجہ[2] سے بھی ان کی لیاقت کا حال دریافت کر سکتے ہیں۔
اگر آپ انھیں کوئی جگہ دے دیں تو آپ کی انجمن[3] کے ایک لائق رکن ثابت ہوں گے۔

والسلام

نیازمند

جوش

(٢)

١٧ فروری ١٩٦٢ء

حضرتِ مکرم، خاور[4] صاحب نگرامی کو آپ کی خدمت میں اِس قوی اُمید کے ساتھ روانہ کر رہا ہوں کہ آپ، ازراہِ معارف پروری، اِن کی لیاقت کی قدر کریں گے، اور کسی معقول ملازمت حاصل کرنے میں اِن کی، دل سے، اور جی کھول کر، اِمداد فرمائیں گے، جس کا یہ عبدِ خاک سار بہت شکر گزار ہو گا۔

نیازمند

جوش

مشفق خواجہ

(۱)

۱۱ر مئی ۱۹۷۶ء

عزیزی خواجہ صاحب۔ آپ کے گرامی نامے کا شکریہ۔

جواب میں بے حد تاخیر ہوگئی، معذرت قبول فرمائیے۔ وجوہِ تاخیر نہ پوچھیے۔ بڑی طویل بات ہو جائے گی۔

اس وقت، فرصت کم، قلم کی نب خراب، اور اعصابی نظام درہم و برہم ہے، بدخطی کارفرما ہے۔ اس لیے جواب کراچی آکر دوں گا۔ میں اٹھائیسویں مئی کو پہنچ رہا ہوں۔ اپنے ہی گھر میں قیام ہوگا۔ آپ کو، بن پڑا تو فون پر مطلع کر دوں گا۔

آپ کا محب
جوشؔ

(۳۵۱) ایف ۳/۶ ۔ اسٹریٹ (۶۰) اسلام آباد

۱۰ر جولائی ۱۹۷۷ء

(۲)

عزیر مشفق خواجہ صاحب آپ مجھ سے نہیں ملے۔ میرے پاس آنا، اپنی شان کے خلاف سمجھا بہت اچھا۔ یُوں بھی اے مہربان ہوتا ہے۔

عالیہ نے جو بات کہی ہے، اسلام آباد جا کر اس پر عمل کروں گا۔ جوش ملیح آبادی مرحوم

کل، سرِشام، منھ کالا کر رہا ہوں...... ولے بخیر گزشت!

بھیم سین ظفر ادیب

(۱)

۵ جنوری ۱۹۵۴ء

مکرمی، یاد آوری کا شکریہ۔ آپ وہ تمام امور نوٹ کر کے مجھے دے دیں معاملہ صیغۂ راز ہیں رہے گا۔ اُمید کہ مزاجِ گرامی بخیر ہوگا۔

نیازمند
جوشؔ

(۲)

آجکل
اولڈ سیکریٹریٹ دہلی
۳۱ جولائی ۱۹۵۴ء

مکرمی۔ گرامی نامے کا شکریہ قبول فرمائیں۔ میں آپ کی ہر ممکنہ خدمت کے لیے بہ خوشی تیار ہوں۔

اس وقت عرشؔ صاحب سے مشورہ کیا۔ انھوں نے اس دفتر میں ایک صورت کے پیدا ہونے کا امکان بتایا ہے۔ آپ کسی وقت عرشؔ صاحب سے ضرور مل لیں۔

میں آج شاید لکھنؤ چلا جاؤں گا، واپسی پر دیکھوں گا کہ صورتِ حال کیا ہے؟

اس کے علاوہ ریڈیو میں بھی واپس آکر سعی کروں گا۔ آپ کے سے معصوم آدمی کی مصیبت سے میرے دل میں درد ہوتا ہے۔ میں ضرور کوشش کروں گا۔

نیازمند
جوشؔ

جدّن بائی

محترمہ

حسن جعفر میرے اقربا میں سے ہے، فلمی تجربہ رکھتا ہے، اداکاری اور افسانہ نگاری بھی کرتا ہے اور ادب و شعر کا بھی اسے ذوق ہے۔ المختصر اس کی ذات میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جن کی صنعتِ فلم سازی کو ضرورت ہے۔۔ آپ کے پاس اسے اِس لیے روانہ کر رہا ہوں کہ یا تو خود اپنے وہاں اسے جگہ دیجیے، یا کہیں اور کھپایئے۔۔ اس قسم کے خط آپ کے پاس بہت سے آتے ہوں گے اور کوئی نتیجہ نہیں نکلتا ہو گا۔ اور نتیجہ نکلنا شاید بہت دُشوار بھی ہے، امیدوار بے شمار اور کام محدود۔ پھر بھی مجھے نہ جانے کیوں یہ خیال ہے کہ آپ حتی الوسع حاملِ رُقعہ کی ضرور امداد کریں گی۔

فلم لائن پر لوگ ٹوٹے پڑ رہے ہیں، قوت و حیات کا لاکھ لاکھ شکر کہ ایں جانب بہ خیر و خوبی اس دلدل سے نکل بھاگے، اور بلندی پر کھڑے ہوئے اِس بھیانک لیکن دامِ فریب غار پر مُسکرا رہے ہیں۔

نرگس سے میری دعا کہیے۔۔ اور اگر جی چاہے تو میرے خط کا جواب بھی دے دیجیے۔ میرا دل آپ سے اب تک رنجیدہ ہے۔ مگر خیر۔ یہ دنیا ہے دنیا۔

پھر بھی نیاز مند

جوشؔ

(تاریخ تحریر ندارد)

جمیل مظہری

(۱)

دہلی۔

۲۷ اپریل ۱۹۵۱ء

سنیے مظہری صاحب، میرے خون میں جو آفریدی پٹھان ہے اُس کا تو یہ فرمان ہے کہ بائی (بھائی) اس آدمی (مظہری) کے خط کا جواب ہرگز ہرگز نہ دے۔ یہ تیرے خطوط کا جواب نہیں دیتا، بہُوت خراب آدمی ہے۔ یہ دبلا والا "بد"۔ خبردار خاں صاحب" بد" کے بعد معاش ہرگز نہ کہنا "اچا بائی"!

لیکن بڑی مشکل تو یہ ہے کہ طبعاً میں سیّد واقع ہوا ہوں۔ اور میرے قلب سیادت میں آپ کا وہ ہے، جسے .... یعنی شعراء وصوفیاء کی زبان میں "عشق" کہا جاتا ہے — اور چوں کہ ہر سالا عاشق پرلے درجے کا بے غیرت، بلکہ " لے شب وصلِ غیر بھی کاٹی " قسم کا نفرا ہوتا ہے، اس لیے میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا" کا ارتکاب کرتا رہتا ہے — اور اسی لیے میرے خطوں کے جوابات ہضم کرنے والے علامہ صاحب، آپ کا یہ نسلاً پٹھان اور طبعاً سیّد عاشق آپ کے خط کا جواب دے اور" شبِ وصلِ غیر" کاٹ رہا ہے۔ آخ تھو، عاشق سالے پر۔

جی ہاں، بلایا تو گیا ہوں پٹنے، لیکن معلوم ہوتا ہے:

ایں قیمتِ گراں کہ بُود گوہرِ مرا
ترسم کہ زنگ روے خریدار بشکند

والا معاملہ درپیش ہے اور مشاعرے کے داعی صاحب حبسِ دم کی مشق فرما رہے ہیں۔

میں اپنے اصول کو نہیں توڑنے کا، اگر مشاعرے والوں نے میرے شرائط بے کم و کاست منظور کر لیے تو آؤں گا۔ ورنہ آپ اور میاں صاحب کے دیدار کی تمنا کو کلکتے کے مشاعرے تک قابو میں رکھوں گا اور کلکتے سے دہلی جاتے ہوئے دو ایک دن کے واسطے پٹنے میں قیام کروں گا۔ مہینے اور تاریخ مشاعرۂ کلکتہ سے بعد کو آگاہ کروں گا۔

اور ہاں، ابھی لکھنؤ میں یہ خبرِ بد پٹنے کے ایک مولانا کی زبان نے سنائی کہ میاں نے داڑھی رکھ لی۔ میاں اور داڑھی۔ ایں چہ بوالعجبی! خدا را اس خبر کی تصدیق نہ کیجیے گا۔ مجھے اِس خیال میں رہنے دیجیے کہ ممکن ہے یہ خبر غلط ہو۔ غلط ہی ہوگی۔ یہ بدتومی جُگَمَن خبر — میاں کی سیادت و غیرت اور اُن کا جمالیاتی شعور بھلا یہ کب گوارا کر سکتا ہے کہ وہ میاں "ناسل" بن جائیں اور جامع القرآن کا خطاب پائیں۔

آپ کے خط سے انتشارِ طبع کا پتا چلتا ہے۔ یہ روش سراسر غلط ہے۔ ہم مردانِ خدا پر انتشار طاری تو ہو سکتا ہے، مگر قابض نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ ع

برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم

بے شک ہم پر غم طاری ہوتا ہے، مگر اس طرح جیسے تیز پرواز طائر کا آبِ رواں پر بھاگتا ہوا عکس، لیکن ہمارا دل اُس کا مہبط و مسکن نہیں بن سکتا۔ ہم "لَا تَحۡزَنُوۡا" کے دائرے کے لوگ ہیں جو غم ہی پر موقوف نہیں۔ تمام دنیا اور تمام علائق دنیا کو گرد کی طرح جھاڑتے رہتے ہیں۔ ہم تمام آلام کو چیلنج دیتے ہیں۔ ع

ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں

جسے غرور ہو، آئے، کرے شکار مجھے! یعنی جنس مادر .... غم کو غرور ہو، سمجھے؟

اس لیے اے میرے دُبلے پتلے نازک اندام متفکر دوست، جوتی کی نوک پر مارو انتشار و الم کو، پھریری لو، اُٹھ کھڑے ہو اور سیدھے ہاتھ کی مٹھی کو زور سے بند کر کے آسمان کی طرف ہات اٹھاؤ اور ہات کو شہدوں کی طرح ہلا ہلا کر قہقہے مارو اور پُکار پُکار کر کہو "اِس پر مارتا ہوں میں آلام کو" جب "اس پر مارتا ہوں" کہو، تو گردن

ذرا اسفل کی جانب جُھکالو، تاکہ آسمانِ کج رفتار یہ دیکھ لے کہ تم آلام کو کس پر مار رہے ہو۔

تمھارا عاشقِ صادق
"صدّیق" نہیں
جوؔش جل جلالہٗ

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر

(۱)

۶ اپریل ۱۹۵۱ء

محترمی کنور صاحب، آپ خود انصاف اور دیانت داری پر نگاہ کر کے غور کریں کہ اگر کوئی صاحب :

۱۔ مجھے اصرار کر کے ٹھہرائیں ۔

۲۔ مجھے دفتر سے رخصت لینے پر مجبور کریں، جس سے میری تنخواہ کے اضافے پر اثر پڑ گیا ہے۔

۳۔ مجھ سے سات آٹھ گیت لکھائیں ۔

۴۔ اُن گیتوں میں بار بار ترمیم کرائیں ۔

۵۔ میوزک ڈائرکٹر وغیرہ سب مل کر اُن گیتوں کو منظور و قبول فرمالیں ۔

۶۔ اور چلتے وقت گیت لکھانے والے صاحب یہ کہیں کہ وہ گیتوں کا معاوضہ آٹھ روز کے بعد (دہلی آکر) ادا کر دیں گے؛ اور ان تمام مرحلوں کے بعد پھر وہی صاحب، جب معاوضہ اُن سے طلب کیا جائے تو آپ کو چپکے سے یہ لکھ دیں کہ وہ گیت استعمال نہیں کر رہے ہیں ۔

اگر یہ بات انصاف اور ایمان کے مطابق ہے تو بے شک میں معاوضے کا طالب نہیں ہوں — اور اگر یہ ناانصافی ہے تو — جانے بھی دیجیے۔ مطالبے سے دست بردار ہو کر میں معاف کرتا ہوں۔ چلیے قصّہ ختم ہوا۔

زندگی میں بھی کتنے تلخ تجربے ہوتے رہتے ہیں۔ مکھن لال صاحب کو میرا سلام ضرور لکھ دیجیے۔ ماشاء اللہ۔

نیاز مند
جوشؔ

(۲)

دیکھیں فیصلہ کیا ہوتا ہے۔

۳۰ اگست ۱۹۵۲ء

دیکھیں فیصلہ کیا ہوتا ہے

سرکارِ والا تبار، آئندہ جمعے کو، آپ کے حسبِ ارشاد غازی آباد جانے کی ’بے صرفہ‘ خستگی قبول کر لینے کا ’فون پر‘ آپ سے وعدہ کرنے کے بعد، تمام اعصاب میں اس تصور کی ژولیدگی محسوس کر رہا ہوں کہ ہائے اب تو، اِس ”غازی مرد“ یعنی جوشؔ کو غازی آباد جانے کا ارتکاب کرنا ہی پڑے گا۔ ”اللہ“ رحم کرے، مگر رحم کرنا ”اللہ“ کے مزاج کے خلاف اور اُس کی ابتدائی تعلیم و تربیت کے منافی ہے۔

اچھا تو پھر ”اللہ رحم کرے“ کے عوض ”بیدی رحم کرے“ کی دعا کیوں نہ مانگوں۔ شاید بیدی سُن لے۔ ممکن ہے نہ بھی سُنے۔ اِس لیے نیچے دو فقرے لکھتا ہوں۔ ان دو میں سے جس ایک فقرے کے سامنے بیدی دستخط کر دے گا، اُس پر مجھے عمل کرنا ہو گا۔

حلقہ در گردنم افگندہ دوست! (دستخط)

۱۔ بیدی نے دعا قبول کرلی۔ جوشؔ غازی آباد نہ جائے۔ (ہپ ہپ ہُرّا) (دستخط)

۲۔ بیدی نے دعا قبول نہیں کی، مردود جوشؔ کو غازی آباد جانا پڑے گا۔ (ہائے مر گئے سالے)

امید و بیم کا راہوار
جوشِ غازی مرد و اطاعت گزار

(۳)

دہلی

۱۱ مارچ ۱۹۵۳ء

ڈھائیں ڈھائیں ڈھائیں، اڑا اڑا دھوں، اڑا اڑا دھوں، غوں غوں غوں، غوں!! اے یہ بے پناہ دھماکے، یہ شور و غل، یہ گرد و غبار، یہ شکست و ریخت، یہ تباہی و بربادی اور یہ ہولناک بم باری! خدا کی پناہ، کوئی خدا کے لیے بتاؤ یہ کیا غلغلہ و ہنگامہ ہے اور یہ کیسی قیامت بَرپا ہے۔ اجی پٹھان پر یہ ایک سکھ کو غصہ آگیا ہے تو پھر تو خوب مزے آئیں گے۔ سکھ اور پٹھان دونوں درندے ہیں، بڑے مزے کی گتھم گتھا دیکھنے میں آئے گی، اور خون خچڑ ہوگا بڑے مزے کا۔ لیکن یہ کیا ماجرا ہے الٰہی، سکھ کے منھ سے تو کف اور دھواں نکل رہا ہے، اور پٹھان سالا دُم دبائے کھڑا ہے۔ جیسے نانی مرگئی ہے بدمعاش کی۔

ہو نہ ہو یہ پٹھان یا تو ہیجڑا ہو چکا ہے یا پھر بڑا ہی وِدوان اور فلسفی ہے، جو لپاڈگی کے عوض اس طرح مسکرا رہا ہے، جیسے کسی معصوم بچے نے اُس کی گود میں پیشاب کر دیا ہو۔

ہاں، اتنا ضرور ہے کہ اس پٹھان کی مسکراہٹ میں تھوڑا سا غم بھی جھلک رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ پیشاب کرنے کے بعد، بچے نے اُسے گالی بھی دی ہے۔

لیکن لیجیے پٹھان پر گالی کا اثر بھی نہیں رہا۔ اب اُس کی مسکراہٹ خالص مشفقانہ ہے

اور وہ پیشاب کیے اور گالی دیے ہوئے بچّے کو پھر گود میں اُٹھانے کی کوشش کر رہا ہے. کوئی حرج نہیں میاں بچّے، نونی سے پیشاب اور منھ سے گالی نکل گئی ہوگی تو کیا ہوا. من جاؤ۔ آؤ میں تمھارا پائجامہ بدل دوں۔ اُوں اُوں، اُوں۔ ارے جب بڑے ہو جاؤ گے تو سب کچھ سمجھ جاؤ گے۔ مَلائی کی بَرف۔ روکو، روکو، مَلائی کی برف والے کو. لو ملائی کی برف کھا لو. قہ قہ، قہ، قہ، ہپ ہپ ہُرّا. جھاڑے رہو کلکٹر گنج، عرقِ بادیاں میں پاؤ بھر پستاں گھول کر لاؤ اور ننھے میاں کو چٹاؤ۔

نامہ نگار

جوشِ بیدار

(۴)

70/1
THE MALL
SIMLA

۱۰ جون ۴ ۱۹۵ء

بیدی صاحب راج دُلارے
بھولے بھالے، پیارے پیارے
نین تمھارے رَس کے دھارے
جن میں کوئل کاجل پارے
دھرتی ماتا. بوجھ سہارے
شملہ تم پر جی کو وارے
ٹہلو آکر ساتھ ہمارے

بیدی صاحب راج دلارے
بھولے بھالے، پیارے پیارے
چٹھی ہے یہ جوش پیا کی
جو نوری ہے، گو ہے خاکی

(۵)

ترقی اُردو بورڈ

اردو منزل
جمشید روڈ
کراچی - ۲۹

۳ مارچ ۱۹۶۲ء

اشد ضروری کابھی جدِ امجد

بندہ نواز، مشاعروں کی شرکت کو اپنے واسطے ننگ سمجھتا ہوں، لیکن اس کا کیا علاج کہ اس کم بخت مشاعرے ہی کی بدولت بچھڑے دوستوں سے ملاقات کا موقع مل جاتا ہے۔

اِس لیے آپ سری رام والے مشاعرے کے واسطے میرے پاس دعوت نامہ بھجوائیے۔ (کرائے کے علاوہ ایک ہزار) اور عیش صاحب ٹونکی کو بھی بُلوائیے (کرائے کے علاوہ ڈھائی سو)

گزشتہ سال سری رام والے مشاعرے میں صرف ایک ہزار مع کرایہ دیا گیا تھا، جس پر میں نے مہتمم مشاعرہ سے کہہ دیا تھا کہ آئندہ میں اس رقم کے ساتھ شریک نہیں ہوں گا۔

ابھی اور بھی بہت کچھ لکھنا تھا کہ ایک ضروری کام کا فون آ گیا، اِس لیے فوراً باہر جا رہا ہوں۔

آپ کا پرستار
جوش

ودیا شنکر صاحب سے بھی اس مسئلے میں بات کیجیے گا۔

(۶)

۱۰ نومبر ۱۹۷۶ء

پیارے کنور صاحب۔ آپ کے بے دلی سے لکھے ہوئے خط کا جواب آج لکھ رہا ہوں۔ آپ نے میرا کوئی کام نہیں کیا۔ حالاں کہ آپ سے، اس قدر بے پروائی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

بہ ہر حال میں فروری میں آنے کا قصد کر رہا ہوں؛ اگر خدا نہ خواستہ زندہ رہا تو آپ کے دیدار سے شاد کام ہوں گا۔

آپ کا چاہنے والا
جوشؔ مرحوم
اسلام آباد

شنکر پرشاد

(۱)

۲۷ اکتوبر ۱۹۴۸ء

محترمی،

میں نے آپ کی خدمت میں درخواست دی تھی کہ میرے مکان میں جس قدر بلب وغیرہ ہیں انھیں براہِ کرم بہ دستور قائم رکھا جائے لیکن اس درخواست کا جو حشر ہوا وہ منسلک مراسلے سے آپ کو معلوم ہو جائے گا۔

وہ شخص جو اپنے قلم سے اپنے ملک میں روشنی پھیلانے کی تقریباً نصف صدی سے کوشش کر رہا ہے، اُسے آزاد ہندوستان میں، یہ دھمکی دی جا رہی ہے کہ تیرے مکان کی بجلی تین روز میں منقطع ہو جائے گی۔ کیا یہ عبرت کا مقام نہیں۔؟

ظلم کے طوفان ہیں، ناقدریوں کی لہر ہے
شاعرِ ہندوستاں ہونا خدا کا قہر ہے

نیاز مند
جوشؔ

بہت اچھا کٹوا دیجیے میرے گھر کی بجلی۔ یہ آپ کی کمشنری کا کارنامہ یاد رہے گا۔

(۲)

۱۰ مارچ ۱۹۴۹ء

بندہ پرور۔

آپ نے مہربانی فرما کے میرے بھائی کی لائسنس کی درخواست منظور فرمائی۔ یہ مجھ پر بڑا کرم کیا۔ کہاں تک آپ کی اس نوازش کا شکریہ ادا کروں، شکریہ ایک ایسی رسمی چیز بن چکا ہے کہ شکریہ ادا کرتے شرم آتی ہے، لیکن یقین فرمائیے کہ ہم اہلِ خرابات کبھی اور کسی عالم میں بھی رسوم کے پابند نہیں ہو سکتے، اور جب ہماری زبان سے کوئی لفظ نکلتا ہے، وہ زبان ہی سے نہیں، دل سے بھی نکلتا ہے۔

آپ کا مخلص

وہی آوارۂ کوے بتاں

جوش

(۳)

۱۱ جولائی ۱۹۴۹ء

شفیق!

کچھ اوپر ایک ہفتہ گزر گیا، یہ خیال کرتے ہوئے کہ آپ کی خدمت میں خط لکھوں، مگر مشاغل کے ہجوم نے فرصت ہی نہیں دی، بہر حال اگر صبح کا بھولا شام کو آجائے تو اُسے بھولا نہیں کہتے۔ میری اس تحریر کو بھی اسی طرح کی ایک چیز خیال فرمائیے۔

بات چھوٹی ہو یا بڑی، حساس دلوں پر بے حد اثر کرتی ہے اور بات کا "چھوٹا" "بڑا" ہونا صرف ایک اضافی (RELATIVE) بات ہے۔ اثرات میں کم و بیش تمام چیزیں اہمیت رکھتی ہیں۔

آپ نے میرے کہنے سے کارلٹن ہوٹل کو بجلی کی لہر بھر عطا فرما دی، اس سے قبل مجھے پستول کا لائسنس مرحمت کیا اور میرے چھوٹے بھائی کو بھی لائسنس دیا۔

اس لیے میرا فرض ہے کہ میں آپ کا نہایت گرم جوشی کے ساتھ شکریہ ادا کروں۔ ہم رندانِ خرابات دکھاوے کی رسمی باتیں نہیں کیا کرتے۔ اس لیے میرے شکریے کو حقیقی اور پائدار شکریہ سمجھیے۔

لگے ہاتھوں یہ بھی عرض کر دوں کہ میں I.A.S. طبقے کا سخت مخالف ہوں۔ اس لیے کہ سیاسی

اور اخلاقی دونوں حیثیتوں سے میں نے اس طبقے کے افراد کو غدار و بے ادب پایا ہے، لیکن جب میں آپ کو دیکھتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ شیطانی کارخانے سے آپ کا سا فرشتہ کیوں کر پیدا ہو گیا۔ آپ کو اپنی شرافت پر ناز کرنا چاہیے۔

نیاز مند
جوشؔ

(۴)

۹ مئی ۱۹۵۰ء

کیا کیا خضر نے سکندر سے
اب کسے رہ نما کرے کوئی

لیجیے صاف جواب آ گیا آپ کی بارگاہِ عالی سے کہ کچھ روشنی کے پوائنٹ کم کرو تو پاور دی جائے۔ یعنی آنکھیں گنواؤ تو برقی لہر پاؤ۔ یہ سب آپ کے شرما صاحب کی بندہ پروری ہے۔

ناصاحب میں پاور سے باز آیا۔ میں اپنے گھر کے نور پر ریفری جریٹر کے سرور کو ترجیح نہیں دے سکتا۔ لگے ہاتھوں یہ نظم پڑھ لیجیے، جو اسی سلسلے میں پانچ منٹ کے اندر، قلم سے بے ساختہ ٹپک پڑی ہے۔

ذرا قافیوں کی داد دیجیے گا۔ بیداد تو آپ کر ہی چکے، اب داد ہی دے دیں تو "بڑی دل نوازی، بڑی مہربانی۔"

فریاد نامہ

مانگی پاور، تو کاٹ آدھے بلب
واہ کیا کیا ملے کرم فرما
حیف مانگا جو برف کا صندوق
وہ دکھانے لگے مجھے گرما
ٹاٹ کا ٹوپ سامنے رکھا
جب کہ میں نے طلب کیا نرما

چاہتے ہیں مجھے نہ حاصل ہو
لطفِ گرما، نہ عشرتِ سرما
مانگتا ہوں جو میں کلی اُن سے
وہ دِکھاتے ہیں دُور سے بَرما
اُن کو بھاتی نہیں مری پرواز
چاہتے ہیں کروں میں پیکر ما
مجھ پہ بجلی گرا کے ہنستے ہیں
جن میں K.K. بھرا ہے وہ شرما!

جوشؔ مرحوم
دہلی

(۵)

۲۷ر جولائی ۱۹۵۰ء

حضورِ والا حیات نامہ حاضر ہے۔

بہت شکر گزار ہوں گا اگر جناب عالی مجھ مردہ صد سالہ کے باب میں یہ تصدیق فرما دیں گے کہ یہ بدبخت اس دنیائے دُنی کے شدائد برداشت کرنے کے لیے بدقسمتی سے ابھی تک زندہ ہے۔ ہر چند زندہ درگور سہی۔ "اللہ" آپ کا بھلا کرے گا اور یہ بندہ شکر گزار ہو گا۔

کیا مختصر جواب یہ ہوتا کہ مر گیا۔

وہی آوارۂ کوئے بتاں
جوشؔ

(۶)

۲۷ر جولائی ۱۹۵۰ء

میرے محبوب کرم گستر۔ کوئی ایک بار، دو بار، تین بار کسی پر مہربانی کرے تو شکریہ ادا کیا جائے، لیکن میں کیوں کر اور کتنے بار آپ کا شکریہ ادا کروں، مجھ پر تو آپ اس قدر مہربانیاں کر چکے ہیں کہ اب شکریہ ادا کرنے کی ہمت ہی نہیں پڑتی۔

میرے اس مغرور سر کو آپ نے اپنے آستاں پر جھکا لیا ہے جو کبھی کسی شاہنشاہ کے در پر بھی نہیں جھکا تھا۔

ایک ٹرک کا پرمٹ کل پرسوں تک مل جائے گا۔ لیکن اب آپ سے پردہ کاہے کا، ایک پرمٹ سے کام ہرگز نہیں چلے گا۔ کیوں کہ روپیہ نہ ہونے کے باعث، ایک صاحب کو ٹرک میں شریک کیے بغیر کام چل نہیں سکتا، اور ظاہر ہے کہ شرکت میں آمدنی بٹ جائے گی۔ اس لیے آپ جیسا کہ درخواستوں میں درج ہے۔ دو پرمٹ اور دلا دیں تاکہ مجموعی آمدنی اتنی ہو جائے کہ میرے بچے اور میری بیوی دونوں زندگی بسر کر سکیں یا پھر ایک بس کا پرمٹ عطا فرما دیا جائے۔ غرض کہ آپ جینے کی کوئی نہ کوئی سبیل نکال دیں۔

میں اور سکینہ آپ کی شرافت پر سر دھن رہے ہیں کہ آپ نے بسمل صاحب کے سر سے مصیبت کا پہاڑ ہٹا دیا ہے۔ مرد یوں ہی کام آتے ہیں۔

یہ بیسویں صدی ہے۔ اس خودغرض صدی میں آپ کہاں سے نکل پڑے آپ میں اتنی شرافت کہاں سے پیدا ہو گئی۔ آدمیوں کا یہ تاج محل کیوں کر بن گیا۔!!

آپ کا پرستار
جوشؔ بادہ خوار

(۷)

۲۴ جنوری ۱۹۵۱ء

میرے کرم گستر

کوئی دو تین دن کی بات ہے کہ ساحلِ جمنا پر میں حسبِ دستور عبادتِ سحر میں مشغول ٹہل رہا تھا کہ پشت کی جانب سے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز آئی۔ سوار میرے قریب آکر ٹھہر گئے تو میں نے انتہائی شوق سے اس امید میں آنکھیں اُٹھائیں کہ آپ کا روئے زیبا دیکھوں گا لیکن چودھری صاحب کے چہرے پر نظر پڑی، میری مایوسی کو دیکھ کر وہ فرمانے لگے کہ آپ کے دوست آج کسی اور طرف نکل گئے ہیں۔ آپ اُن کی غیر حاضری پر چند شعر ضرور کہیں۔ چنانچہ چند شعر حاضر ہیں جو میرے دل کی آواز ہیں :-

ہزار حیف کہ ساحل پر آج وقتِ سحر
فضا ملول تھی، دریا بھی خوش گوار نہ تھا
جو سر میں گونج اُٹھے وہ نہ تھی صدائے چمن
جو دل کو موہ لے وہ رنگِ سبزہ زار نہ تھا
جو ولولوں کو جگاتا ہے صبح کے ہنگام
وہ لطفِ نغمۂ مُرغانِ شاخسار نہ تھا
اُفق کی گود میں بھی تھی نہ تابِ روئے حبیب
صبا کی لہریں بھی عطرِ زلفِ یار نہ تھا
مرے ندیم تجھے کچھ خبر بھی ہے اس کی
کہ آج باغ میں کیوں حسنِ برگ و بار نہ تھا
سبب یہ ہے کہ گلستاں میں آج وقتِ سحر
گلوں کو ناز ہے جس پر وہ گل عِذار نہ تھا
ہزار حیف کہ حلقے میں شہ سواروں کے
فدا ہے جس پہ مرا دل، وہ شہ سوار نہ تھا

بندۂ مدہوش
مرحوم جوش
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا!

(۸)

۱۲ر جون ۱۹۵۱ء

چھوڑ جاتا ہے جو وہ گھر میں اکیلا مجھ کو
در و دیوار سے رونے کی صدا آتی ہے

میرے دل نواز و چارہ ساز، آپ خیر سے کشمیر چلے گئے، اور میرے واسطے بھری پُری

دہلی سونی ہو کر رہ گئی۔ آپ کے بغیر یہ راج دھانی ایسی نظر آرہی ہے جیسے کسی حسین کی نتھ اُتر گئی ہو۔

آپ تو جنّت میں ہیں، آپ تصوّر نہیں کر سکتے کہ ایک نامُراد دوزخی آپ کو کس بُری طرح یاد کر رہا ہے۔

میرے محترم دوست، اگر خدا موجود ہوتا تو میں اُس کا واسطہ دے کر آپ سے کہتا کہ خدا کے واسطے پلٹ آیئے، جلد تر پلٹ آیئے۔

یہ خوب جانتا ہوں کہ آپ وقت سے پہلے ہرگز نہیں آنے کے۔ اس صورت میں اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں کہ آپ سے یہ خواہش کروں کہ براہِ کرم، اپنی خیریت، اور حالاتِ سفر ہی سے مطلع فرمایئے۔

مجھے یقین ہے کہ بیوی بچّوں کی موجودگی میں "خدا کے فضل سے" آپ کا یہ سفر خوش گوار ثابت نہیں ہوگا اور چوں کہ میں دہلی ہی میں پڑا ہوا ہوں، مجھے اس تصور سے خوشی ہو رہی ہے کہ آپ بھی وہاں خوش نہیں ہوں گے، اور جلیئے تنہا۔

ہم بھی کالے، یار بھی کالا!

آپ کے جواب کا اُمیدوار
وہی جوشِ بادہ خوار

(۹)

۸ اگست ۱۹۵۱ء

سنیے حضورِ والا۔ بدقسمتی اس کا نام ہے ــ کشمیر جانے سے بیشتر آپ نے وعدہ کیا تھا کہ میرے بیٹے کو "بار" کا لائسنس عطا فرمادیں گے۔ آج معلوم ہوا کہ وہ لائسنس آپ نے کسی اور کو عطا فرمادیا۔ میں اپنے کو اس خوش قسمتی کے موقعے پر جان و دل سے مبارک باد دیتا ہوں۔

مبارک ہو جوش صاحب قبلہ، آپ کے پیارے دوست شنکر پرشاد صاحب نے آپ کے بیٹے کو دنیا میں اس لیے چھوڑ دیا کہ وہ آپ کے انتقال فرما جانے کے بعد ٹھوکریں کھاتا

پھرے۔ خطا معاف، جوش صاحب! اب تو آپ ماشاء اللہ بڑے ہی اطمینان کے ساتھ انتقال فرمائیں گے۔

بولو شنکر پرشاد جی کی جے!

(۱۰)

۱۱ر دسمبر، ۱۹۵۱ء

ہم سے کتنے ہی تری راہ میں برباد رہے
تو سلامت رہے، کوچہ ترا آباد رہے

بندہ پرور، شکایت اس بات کی نہیں ہے کہ ہری چند اختر کی جگہ راجندر ناتھ شیدا کا تقرر کیوں کیا گیا۔ اور اس کی دو وجہیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ آپ میری سفارش کے پابند نہیں آپ کو اختیار حاصل ہے کہ جسے چاہیں رکھیں اور جسے چاہیں نہ رکھیں، میں کون ہوتا ہوں جو دخل دوں۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ شیدا صاحب بھی میرے دوست اور لائق آدمی ہیں۔ میں خود اُن کے واسطے کئی جگہ کوشش کر چکا تھا، اور اب اس خیال سے خوش ہوں کہ وہ برسرِ روزگار ہو گئے ہیں۔

لیکن مجھے آپ سے اس بات کی بے حد شکایت ہے کہ آپ نے شیدا صاحب کے تقرر کے وقت مجھے طلب کر کے یہ نہیں سمجھایا کہ آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں۔ اگر آپ ایسا کرتے تو ظاہر ہے کہ میں شیدا صاحب کی مخالفت تو ہرگز نہ کرتا، لیکن میرے دل کو اس خیال سے بڑی تسکین ہو جاتی کہ آپ نے مجھے بھی اپنا ایک نیاز مند سمجھا۔ ایسا نیاز مند جس کی تھوڑی بہت رعایت کی جاتی ہے۔

مجھے آپ سے بہت محبت ہے۔ اس لیے نہیں کہ آپ "چیف کمشنر بہادر ہیں" بلکہ اس لیے کہ میں نے آپ کو ایک ایسا انسان پایا ہے، جو اس زمانے میں کہیں دور دور بھی نظر نہیں آتا، اور اپنی اسی محبت کی بنا پر میں آپ کی ذات پر اپنا یہ حق سمجھتا ہوں کہ آپ مجھ سے محبت نہ کرتے ہوئے بھی کوئی ایسی بات نہ کریں جس سے میرا دل ٹوٹ جائے۔ لیکن افسوس کہ آپ نے میرے دل کو توڑ

دیا۔ خیر سلامت رہیے۔

ساجن، درپن ٹوٹ گیا!!

پھر بھی آپ کا شیدائی
جوشؔ

(۱۱)

۱۷ جنوری ۱۹۵۲ء

میرے محبوب کرم فرما،

ہری چند صاحب اختر ایم۔اے کے باب میں پھر عرض کرتا ہوں کہ آپ کی مہربانی کی اُمید میں وہ ایک مدتِ دراز سے رخصت پر ہیں۔ لیکن اب اُن کی رخصت بارہ دن کی اور باقی رہ گئی ہے۔

بس ان بارہ دنوں ہی کے اندر اندر اگر آپ کی چشمِ کرم اُن کی طرف اُٹھ جائے تو بڑی عنایت ہو۔

ورما صاحب کہتے ہیں کہ وہ اختر صاحب کو انفارمیشن میں جلد لے لیں گے۔ یہ آپ کے علم میں آجانا اختر صاحب کے حق میں بہت مفید ہے کہ اختر صاحب گورنمنٹ آف انڈیا میں انفارمیشن افسر رہ چکے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ سات آٹھ برس تک حکومتِ ہند میں مختلف ذمّہ دار عہدوں پر گزیٹڈ آفیسر کی حیثیت سے سات آٹھ سو روپے ماہانہ پر بہ خیر و خوبی کام کر چکے ہیں۔

اِس سے آپ کو اندازہ ہو سکتا ہے کہ میں آپ کے روبرو خالص عربی گھوڑا لا رہا ہوں، خچر کو پیش نہیں کر رہا ہوں۔ سمجھے حضورِ والا؟

اب بھی آپ نہ سمجھیں تو خدا مجھ سے سمجھے

نیاز کوش
جوشؔ

اب رہا میرے لڑکے کے پرمٹ کا سوال، جو چھے مہینے کی اُمیدواری کے بعد

ناامیدی میں بدل گیا، اس کے متعلق زیادہ نہیں لکھوں گا۔ وہ آپ کا بچہ ہے، آپ چاہیں نوازیں چاہیں نہ نوازیں۔

(۱۲)

۲۵مارچ ۱۹۵۲ء

میرے محبوب اور میرے محسن، کاش آپ کو بھول جانے کی عادت نہ ہوتی۔ قدرت نے آپ کو کس درجہ شریف انسان بنایا ہے، آپ کو کس قدر خوبیاں بخشی ہیں، آپ کی فطرت کو کتنا حیرت ناک حسن و جمال عطا فرمایا ہے لیکن ان تمام قابلِ پرستش صفتوں کے ساتھ ساتھ آپ کو بھول جانے کا مادّہ بھی دے دیا ہے جس سے بنے بنائے کام بگڑ جاتے ہیں اور ہونے والے کام ہوتے نہیں۔

میرے ولی عہد بہادر کے پرمٹ ہی کو لے لیجیے۔ ڈیڑھ برس سے امیدواری کر رہا ہوں اور اسی امید میں جی جی کر مر رہا ہوں۔

آپ نے ہو نہ ہو شاید دل ہی دل میں یہ امر طے فرمالیا ہے کہ جس روز میں انتقال فرما جاؤں گا اس کے عین تیسرے دن آپ میرے یتیم بیٹے کو پرمٹ دے کر اس کے غم اور نقصان کی تلافی کردیں گے ـــــ بہت اچھا، اگر یہی مرضی ہے سرکار کی، تو یہ بندۂ ناچیز اور یہ آپ کا چاہنے والا رندِ خراباتی ایڑی چوٹی کا زور لگادے گا اس امر میں کہ جلد سے جلد انتقال فرما جائے۔

کہا جو جینے کو، جی اُٹھے ہم، کہا جو مرنے کو مر گئے ہم
اب اور کیا چاہتا ہے ظالم ترے اشاروں پہ چل رہے ہیں

بندۂ درگاہ
جوشؔ مرگ خواہ
سبحان اللہ، سبحان اللہ!!

اور نکلے ہوئے ہیں پر بھی چند آخر بھی ماشاءاللہ!!!

(۱۳)

۱۹۵۴ء

حضرت سلامت! مخلصانہ صاف گوئی، تمام اچھی باتوں کی طرح اگر اب تک ایک ناروا ناجائز بات قرار نہیں دے دی گئی ہے تو مہربانی فرما کر مجھے یہ عرض کرنے کی اجازت مرحمت فرمائیے کہ آپ نے کل ریڈیو کے مشاعرے کی صدارت سے انکار فرما کر میرے دل کو آزار بھی پہنچایا اور ریڈیو والوں کے روبہ رو، جنھیں یہ یقین تھا کہ آپ خصوصیت کے ساتھ میری اس ذرا سی درخواست کو تو ٹھکرا ہی نہیں سکتے، مجھے بے آبرو بھی کیا۔

آپ سے اس قدر بے مروّتی اور رکھائی کا اندیشہ نہیں تھا۔ خیر اچھا کیا جو کچھ کیا۔

دوسری بات یہ عرض کرنا ہے کہ بہ راہِ عنایت، اس منسلک درخواست کو ضرور منظور فرما لیجیے۔ یہ درخواست سجّاد حیدر کے پٹرول پمپ میں سروس اسٹیشن قائم کرنے کے لیے ہے کیوں کہ اس مقابلے کے زمانے میں سروس اسٹیشن کے بغیر خالی پٹرول پمپ ایک بے معنی سی چیز ہے۔

آپ کا پرستار
جوشِ قدح خوار

(۱۴)

۹ فروری ۱۹۵۴ء

بندہ پرور، تین چار خط آچکے رئیس احمد کے کہ آپ سے دو تعارفی خطوط بھاٹیا صاحب کمشنر لکھنؤ اور ڈپٹی کمشنر سیتاپور کے نام لکھا کر انھیں بھیج دوں۔

اگر زحمت اور کوئی مصلحت مانع نہ ہو تو مہربانی فرما کر یہ دونوں خط تحریر کر کے، میرے پاس روانہ فرما دیجیے۔

نیاز مند
جوشؔ

اچھا کیا کہ آپ نے ریڈیو مشاعرے کی صدارت کے انکار پر جو شکایت نامہ میں نے بھیجا تھا اُس کا جواب نہیں دیا۔ جواب جاہلاں باشد خموشی! جی ہاں اور کیا، شکریہ۔

(۱۵)

۱۹۵۴ء

میرے محبوب، شملے میں آپ کی یاد ستا رہی ہے۔ پرسوں سے کئی بار دل میں یہ بات آئی کہ اگر آپ بھی یہاں ہوتے تو کیا لطف آتا۔

آپ کی صحبت نے مجھے بے کار کر دیا ہے، واللہ کسی اور کی صحبت میں جی ہی نہیں لگتا۔ اے بلبلِ ہزار داستاں تیرے سامنے تو بڑے بڑے پرندے کالے کوّے نظر آتے ہیں۔

کیا کوئی صورت نکل سکتی ہے آپ کے یہاں آنے کی۔ شاید نہیں، کیسی بدنصیبی ہے۔ شملہ آپ کے بغیر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے محفل شمع کے بغیر اور حسین عورت کی ایک جائی بے شراب کے۔ سارا جی لگا ہوا ہے میرا آپ میں۔ کیوں کہ آپ کو بخار میں چھوڑ آیا تھا۔ اب تو نصیبِ دشمناں بخار نہیں ہے۔

اور ہاں وہ گم شدہ گھڑی ملی کہ نہیں، حیرت ہے اُس کے گم ہو جانے پر۔ اب آئندہ سے گھڑی اُتار کر میز پر نہ رکھیے گا اور اُس کی گھڑی گھڑی کی خیر منایئے گا۔ کیا معاملہ ہوا، سمجھ میں نہیں آتا۔

اپنے مزاج کی کیفیت سے جلد از آگاہ فرمایئے اور ایک ہفتے کے واسطے شملے آنے کا وعدہ کر لیجیے۔ خواہ جھوٹا ہی سہی۔ فریبِ وعدۂ دیدارِ یار کیا کہنا!

آپ کا پرستار
وہی آوارۂ کوہ سار
یعنی جوشِ بادہ خوار

(۱۶)

۲۶ جون ۱۹۵۴ء

لیجیے حاضر ہیں یہ میرے بھانجے اور داماد التفات۔ عرض کر چکا ہوں کہ یہ دہلی کالج سے محض تین سو روپے پاتے ہیں۔

نو بچے، ایک بیوی، ایک خود، اور کم سے کم ایک نوکر، سب ملا کر ایک درجن آدمیوں کی

پرورش کو دیکھیے اور تین سو رُپلیوں پر نگاہ کیجیے۔ اور پھر اس زمانے کی گرانی پر نگاہ ڈالیے۔

التفات معمولی گریجویٹ نہیں۔ واقعی پڑھا لکھا آدمی ہے، ایمان دار، وفادار، محنتی اور سمجھ بوجھ رکھنے والا ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہ اپنے فرائض اس قدر غیر معمولی قابلیت سے انجام دے گا کہ آپ کو دل ہی دل میں یہ کہنا نہیں پڑے گا کہ جوشؔ مردود نے میرے گلے میں کیسا بندر باندھ دیا ہے۔

دہلی کالج کے تمام اُستادوں کو فوجی تربیت دیے جانے کا فتنہ بہت جلد برپا ہونے والا ہے اور چوں کہ اس سلسلے میں آدمی پر آدمی چڑھا کر دوڑا جاتا اور ماں کی گالی دی جاتی ہے۔ اس لیے التفات مستعفی ہو جائے گا۔ جس کے یہ معنی ہوں گے کہ یہ تین سو ماہانہ کی رقم بھی بند ہو جائے گی۔ اس لیے بندہ پرور جس قدر جلد ہو اسے روزگار سے لگا کر میرے سر کا سب سے بڑا بوجھ اُتار دیجیے۔ ورنہ اس خاکسار کا انتقال ہو جائے گا اور آپ "ہائے" کر کے رہ جائیں گے اور پھر پچھتانے اور ہوش میں آنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

اتنا اور سن لیجیے کہ اس التفات کی زبان موٹی ہے، یہ آپ کو اپنی باتوں سے ہرگز متاثر نہیں کر سکے گا، لیکن یقین فرمایئے کہ اس کی زبان جس قدر موٹی ہے، ویسی ہی اس کی عقل باریک ہے۔

آپ کا پرستار
جوشؔ

(۱۷)

70/1
THE MALL
SIMLA

۲ جولائی ۱۹۵۴ء

بندہ پرور، یہ گناہ گار کاغذی روپ میں پھر نمودار ہوا ہے۔ سلام قبول فرمایئے۔ کل سے یہاں بارش کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ اس وقت دھواں دھار گھٹائیں جھوم رہی ہیں۔

اُٹھی گھٹا وہ رنگ و بو کا کارواں لیے ہوئے
جِلو میں کائنات کی جوانیاں لیے ہوئے

دھواں دھواں سیے ہوئے بلندیوں پہ چرخ کی
بلندیوں پہ چرخ کی دھواں دھواں لیے ہوئے

وہاں دہلی میں کیا رنگ موسم ہے۔ خدا کرے ایک آدھ چھینٹا وہاں بھی پڑ چکا ہو اور آپ لُو کے شدائد سے محفوظ ہو چکے ہوں۔ آپ کی یاد اس وقت بہت ستا رہی ہے۔ جی چاہتا ہے آپ کو پولس کے ذریعے سے یہاں پکڑوا بلاؤں۔ میں چار پانچ روز کے بعد منالی چلا جاؤں گا، ذرا جلدی سے جواب دیجئے تاکہ یہیں شملے میں مل جائے اور میں آپ کے خط کی شیرینی لیے ہوئے منالی کی طرف چل پڑوں۔

پرسوں مجھے اس قدر غصہ آگیا تھا کہ اگر گولی کھایا ہوا شیر ببر بھی میرے سامنے آجاتا تو میں اُس کے دونوں کان نوچ کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دیتا۔

بات یہ ہوئی کہ میں نے پنڈت جواہر لال کے سکریٹری کو فون کیا کہ میں پنڈت جی سے ملنا چاہتا ہوں۔ وہ مردود غالباً مدراسی تھا۔ پہلے تو اس کی سمجھ میں میرا "اسم مبارک" ہی نہیں آیا۔ جب میں نے انگریزی میں اپنے نام کے ہجے بتائے JOSH تو اس گدھے نے مجھ سے کہا کہ آپ اپنے کچھ PARTICULARS بھی بتائیے تو میں نے کہا کہ آپ میرا صرف نام پنڈت کے سامنے لے جائیے، وہ سمجھ جائیں گے۔

دو گھنٹے کے بعد اُس جانگوش نے مجھ سے فون پر خشک لہجے میں یہ کہا کہ پنڈت جی یہاں آرام کرنے آئے ہیں، آپ دہلی میں مل لیجیے گا۔

بس یہ سننا تھا کہ دماغ کے چیمبر میں دھائیں سے ایک ایٹم بم پھٹ گیا اور اسی غضب ناک عالم میں پنڈت جی کو میں نے ایک شعلہ فشاں خط لکھ ڈالا۔

میں نے پنڈت جی کو لکھا کہ آپ نے میری سخت توہین کی ہے جسے میں معاف نہیں کر سکتا آپ مجھے اپنا بزرگ کہتے ہیں، کیا ہندوستان میں بزرگوں کے ساتھ اب یہی سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ آپ پرائم منسٹر سہی اور میں فقیر سہی، لیکن میری فقیری میں اس قدر غرور ہے کہ مر جاؤں گا، لیکن آپ سے اب کبھی نہیں ملوں گا۔

اس خط کے بعد اندرا کا فون آیا کہ کل پانچ بجے میرے ساتھ چائے پیجیے۔ میں نے اندرا کی دعوت قبول کر لی، مگر یہ تہیہ کر لیا کہ اندرا کے باپ سے اگر وہ اصرار بھی کریں گی، ہرگز نہیں ملوں گا۔

لیکن جب وہاں پہنچا تو پنڈت جی سامنے ہی کھڑے ہوئے تھے، مجھے دیکھ کر مسکرائے، میں نہیں مسکرایا، وہ بڑھے اور کہنے لگے پہلے چائے پی لیجیے۔

چائے کے بعد انھوں نے شکایت کی کہ ایسا گرم خط آپ کو نہ لکھنا چاہیے تھا۔ میں نے کہا ہم لوگ شیشہ گری کی دوکانیں ہیں۔ اس دوکان میں آہستہ سے قدم رکھنا چاہیے۔

اس کے بعد پنڈت جی نے مجھے سمجھایا کہ میں نے یہ نہیں کہا بلکہ وہ کہا تھا، آپ کو غلط فہمی ہوگئی۔ تب جاکر اس پٹھان کا غصہ ٹھنڈا ہوا۔

میں نے یہ ساری کتھا آپ کو اس لیے نہیں لکھی ہے کہ آپ سے اس امر کی داد لوں کہ دیکھیے میں کس قدر تُنک مزاج ہوں۔ اس لیے کہ تُنک مزاجی میرے نزدیک بااوقات کوئی ایسی چیز نہیں ہوتی جسے وصف یا ہُنر کہا جاسکے۔

بلکہ اس کے برعکس میں آپ کو یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ پرائم منسٹر کس قدر غیر معمولی شریف انسان ہے۔ اگر میں اس قدر لودیتا ہوا خط کسی معمولی سب انسپکٹر پولیس کو بھی لکھ مارتا تو لڑائی ہو جاتی، یا کم سے کم تعلقات کا رشتہ عمر بھر کے واسطے منقطع ہو جاتا۔

واقعی یہ نازک اندام آدمی، جسے جواہر لال نہرو کہتے ہیں، ہر حیثیت سے اس قابل ہے کہ اُس سے شدّت کے ساتھ محبت کی جائے اور خوب بھینچ بھینچ کر اُس کا منہ چُوما جائے۔

آپ کا پُوجنے والا

شبیر حسن خاں جوش

حضور والا، ذرا التفات پر جلد التفات فرمایئے، میری کشتی میں بہت پانی جمع ہو رہا ہے۔ ہر چند اُلیچ رہا ہوں مگر پانی بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔

ڈوبنے سے پہلے ناخدائی فرمایئے۔

(۱۸)

تاریخ تحریر ندارد

رکھیو غالبؔ مجھے اس تلخ نوائی سے معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

میرے مہربان و محبوب دوست شنکر پرشاد صاحب، لوگ، آپ کے محکمے میں نوکری کے واسطے میرے پاس آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آپ شنکر پرشاد صاحب کا ہاتھ پکڑ کر اُن سے حکم لکھا سکتے ہیں اور میں دل ہی دل میں کہتا ہوں کہ یہ لوگ کتنے احمق ہیں، اگر شنکر پرشاد صاحب میرے ایسے ہی اختیار میں ہوتے تو میرے داماد کے تقرر میں اس قدر ہَول ناک تاخیر کیوں کرتے۔

جناب والا، اب زندگی کے شدائد سے تنگ آکر میری لڑکی میرے ہی پاس آگئی ہے۔ اس لیے کہ میرے داماد کو تین تین مہینے تک تنخواہ نہیں ملتی ہے اور بے تنخواہ کوئی زندگی بسر نہیں کر سکتا۔

داماد کو صرف پونے تین سو تنخواہ ملتی ہے جس میں پورا نہیں ہوتا اور جب وہ بھی مہینوں نہ ملے تو آدمی جی کیوں کر سکتا ہے۔

میں لڑکی اور لڑکے کا بار کس طرح اُٹھا رہا ہوں۔ آپ تصوّر بھی نہیں کر سکتے۔

اگر آپ کو میرے ساتھ محبت یا کم سے کم ہمدردی ہے تو التفات کو اپنے محکمے میں جلد تر لے لیجیے۔ اب زیادہ انتظار نہ کرائیے۔ میں پاگل ہونے کے قریب ہوں۔ بس

دردانگیز امیدواری سے مایوسی بہتر ہوتی ہے بندہ نواز۔ آپ کا پرستار

تاریخ تحریر ندارد (۱۹) جوشؔ

بندہ پرور، دوسروں کی سفارش کرتے ہوئے جو کہنا ہوتا ہے میں آپ سے بے دھڑک کہہ گزرتا ہوں لیکن اب اپنے متعلق کہنے کا جو موقع آیا ہے تو بے تکلفی کے باوجود شرمایا جا رہا ہوں۔ بہت مشکل بات ہے لیکن کہنا ہی پڑے گا۔

جہاں تک دُنیوی عقل کا تعلق ہے میں ایک "خالص احمق" آدمی ہوں۔ اس لیے اپنی عقل سے نہیں بلکہ اپنی زوجۂ محترمہ کی عقل سے یہ خط لکھ رہا ہوں۔

میری بیوی مجھ سے کہتی ہیں کہ تم نِرے پاگل ہو۔ شنکر پرشاد صاحب سے اپنی حالت صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیتے کہ تمھیں اُن کی امداد کی سخت ضرورت ہے اور اگر شنکر پرشاد

صاحب چاہیں تو تمہاری ساری مصیبتیں دُور ہو سکتی ہیں۔ اور وہ اس طرح کہ :

۱۔ سجّاد کو ٹرک چلانے، یا اسی قسم کا کوئی پرمٹ دے دیں، تاکہ وہ روزی کمانے لگے اور ہم دونوں اس اطمینان کے ساتھ مریں کہ وہ ٹھوکریں کھاتا نہیں پھرے گا۔

۲۔ "شعلہ و شبنم" کے واسطے شنکر پرشاد صاحب اپنے براہِ راست اثر سے اشتہارات دلا دیں۔ کنور مہندر سنگھ سے یہ کام نہیں ہو سکتا۔

۳۔ اور اُس کم بخت شنکر لال کو ذرا سا اشارہ کر دیں کہ وہ "شعلہ و شبنم" اور "بک ڈپو" کی مالی امداد کر دے۔ چھ ہزار اُس کے نزدیک ایک نہایت حقیر رقم ہے لیکن زمانے کی رفتار نے آج ہماری یہ حالت کر دی ہے کہ چھ ہزار کی سی حقیر رقم ہمارے نزدیک نہایت اہم ہے۔

سو حضور والا، یہ تین کام آپ کے سپرد کر رہا ہوں، اللہ کے بھروسے پر نہیں، صرف آپ کی محبت و شرافت کے بھروسے پر۔ جی میں آئے تو یہ کام کیجیے، نہ آئے تو نہ کیجیے۔ میں ہر حالت میں آپ کو چاہے جاؤں گا۔ چاہنے والوں کو اس کی پروا نہیں کہ معشوق بے وفا ہے، یا وفادار۔

البتہ ایک بات کہ دوں اور وہ یہ ہے کہ اگر میری امداد سے آپ کی پوزیشن پر کوئی حرف آتا ہو تو میں آپ سے اپنے سر کی قسم دے کر یہ کہتا ہوں کہ ہرگز ہرگز میری امداد نہ کیجیے گا۔ اس لیے کہ آپ کی پوزیشن کو میں اپنی جان کے برابر سمجھتا ہوں۔

شرمندگی کے بار سے دبا ہوا

جوشؔ بادہ نوش

(۲۰)

B. ۳۰۹
سندھ مسلم ہاؤسنگ سوسائٹی،
کراچی؛ ا ر دسمبر ۱۹۵۵ء

میرے محبوب دوست، یہ کاغذات اور یہ خطوط، براہِ کرم سجّاد کو اپنی خدمت میں طلب فرما کر

اس کے حوالے کر دیجیے

سجاد کا پتا ہے 86/C تیماپور، اگر آپ عرش صاحب کو فون کر کے اُن سے یہ ارشاد فرما دیں گے کہ سجاد کو آپ کے پاس فوراً روانہ کر دیں تو وہ آ جائے گا۔

سجاد سے یہ بھی کہ دیجیے گا کہ وہ آپ کے پاس روپیہ جمع کر دے اور آپ سے، جیسا کہ زبانی عرض کر چکا ہوں۔ مزید یہ کہنا ہے کہ آپ اس سلسلے میں حسبِ مراد امداد فرما دیں۔

میں اپنے اہلِ خاندان کو یہاں نصب کر کے دہلی آؤں گا، اور آپ کے جمالِ جہاں آرا سے آنکھوں کو روشنی سے دوچار کروں گا۔

یہاں جب تنہا بیٹھتا ہوں تو دل سے برابر آواز آتی رہتی ہے۔

"ہائے شنکر پرشاد، ہائے شنکر پرشاد، یہ کیا جادو کر دیا ہے آپ نے میرے دل پر؟

آپ کا عاشقِ زار
جوشؔ بادہ خوار

بگرامی خدمت شنکر پرشاد صاحب محبوبِ جوشؔ

(۲۱)

۲۰۹ B.
سندھ مسلم ہاؤسنگ سوسائٹی
کراچی
۹ دسمبر ۱۹۵۵ء

میرے محبوب دوست، آپ نے اب تک بھولے سے بھی یاد نہیں کیا اس کا بے حد قلق ہے۔

بہ ہر حال کسی اور وقت یہ دکھڑا بیان کروں گا۔ اس وقت یہ کہنا ہے کہ وہ پانسو روپے جو آپ کے P.A. نے میری جانب سے جھانسی روانہ کیے تھے۔ معلوم ہوا ہے کہ اب تک وہاں نہیں پہنچے ہیں۔

ممکن ہے کہ وہ روپے واپس آ گئے ہوں، اگر ایسا ہے تو اپنے P.A. کو براہِ کرم ہدایت

فرما دیجیے کہ وہ مندرجہ ذیل پتے سے :

عبداللہ خاں، میرزا گنج، ملیح آباد (لکھنؤ)

روپیہ روانہ کردیں۔

سجاد کو طلب کرکے کہہ دیجیے کہ ایمرجنسی سرٹیفکٹ کے بعد ہندوستانی کسٹم سے کوئی تعلق باقی نہیں رہتا۔ وہ راجہ غضنفر علی خاںؒ سے اسباب کے یہاں لے آنے کا اجازت نامہ لے لیں۔

باقی پھر —

آپ کی محبت کا گرفتار
وہی جوشؔ بادہ خوار

(۲۲)

۲۰۹ B.
سندھ مسلم ہاؤسنگ سوسائٹی
کراچی
۲۴ردسمبر ۱۹۵۵ء

حضرت، آپ کی جوتی کو کیا غرض پڑی ہے کہ مجھ دُور افتادہ کو خط لکھنے کی زحمت گوارا فرمائیں۔

اِس وقت دو نہایت ضروری اور اہم کاموں کے واسطے آپ کو یہ خط لکھ رہا ہوں۔

ایک بات تو یہ ہے کہ میرے نہایت قدیم و قابل دوست حبیب اللہ صاحب رُشدی کو ڈال میاسی منٹ کا ڈیلر بنوا دیجیے۔

اِس کام میں خواہ آپ کو کتنی ہی محنت و زحمت کا سامنا ہو مگر اس کام کو کر دیجیے ضرور۔ اگر آپ یہ سمجھیں کہ یہ کام سفارش سے نہیں پیٹنے سے چل سکتا ہے تو میں آپ سے درخواست کروں گا کہ آپ بے دریغ ڈال میا کو پیٹ ڈالیں اور رُشدی صاحب کو ڈیلر بنوا دیں۔ یہ احسان میری ذات پر ہوگا بندہ پرور۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ میرا خاندان ابھی تک دہلی میں پڑا ہوا ہے۔ آپ سجاد کو اسی

وقت طلب کر کے تاخیر کے اسباب معلوم کریں اور بن پڑے تو اُس اُلّو کے پٹھے کی مدد کر دیں۔

آپ کا شکوہ سنج

جوشؔ

اور ہاں سجاد کو چالیس روپے دے دیجیے گا کہ وہ اظہار کو دے دیں۔ بیوی کو میں نے لکھا تھا کہ وہ اظہار کو روپے دے دیں مگر اُن کا تحمل روپے نہیں دینے دے رہا ہے۔ زندہ رہا تو دہلی آکر آپ کا یہ روپیہ واپس کر دوں گا۔

(۲۳)

B. ۲۰۹

سندھ مسلم ہاؤسنگ سوسائٹی

کراچی

۱۳ اپریل ۱۹۵۶ء

حضرتِ مکرّم۔ نہ آپ نے اب تک خود ہی خط لکھا، نہ میرے خط کا جواب ہی دیا ہے۔ اگر میرے بھتیجے افتخار علی کا معاملہ نہ ہوتا تو میں آپ کو خط لکھ کر بے حیائی کا ارتکاب نہ کرتا۔ اگر آپ یہاں کے مینجر کو افتخار علی کے واسطے براہِ کرم ہدایت کر دیں تو وہ روزگار سے لگ جائے گا اور میں آپ کا احسانمند ہوں گا۔ اور اگر آپ نہیں لکھیں گے تو جس طرح کہ آپ نے میرے داماد کے لیے کچھ نہیں کیا تھا اور میں اپنا سا منہ لے کر رہ گیا تھا، اس موقعے پر بھی خفیف ہو کر بیٹھ جاؤں گا۔

لیکن اس کے باوجود آپ کی محبت سے دست بردار نہیں ہوں گا۔ اللہ اکبر آپ کی محبت بھی کیسی ضدی ہے کہ آپ مجھے ٹھکراتے ہیں لیکن وہ ہلنے کا نام نہیں لیتی۔ واقعی عاشق سالا بڑا بے غیرت ہوتا ہے۔

جواب سے مایوس

جوشؔ

رام پرکاش ساحر ہوشیارپوری

(۱)

8, OLD AGHA KHAN
BUILDING,
HAINES ROAD,
JACOB CIRCLE
BOMBAY (11)

۲ مارچ ۱۹۴۸ء

مکرمی! دعوت نامہ پہنچا۔ یادآوری کا شکریہ!

"قیام وطعام کا انتظام" "اخراجاتِ سفر" اور "مناسب زرِ ہدیہ" بھلے آدمی کو اِن چھوٹی چھوٹی باتوں سے بلند ہونا چاہیے، لیکن جب مالی حالت میں ابتری واقع ہو چکی ہو تو بھلا آدمی اِن باتوں سے کیوں کر بلند ہو سکتا ہے۔

اگر آج کل میرے حالات میں اَبتری نہ ہوتی تو میں خود اپنی جیب سے خرچ کر کے آتا، کیوں کہ سحرؔ صاحب کی ذات سے مجھے بہت عقیدت ہے اور اس کے دوش بہ دوش مجھے قیام وطعام سے دِلی بغض ہے، لیکن کروں تو کیا کروں۔

سب سے زیادہ مصیبت تو یہ ہے کہ جب کبھی میں یہاں سے شمالی ہند کا سفر کرتا ہوں، کسی طرح پندرہ سو سے کم مصارف نہیں ہوتے۔ ہزار بار سعی کی کہ مصارف کو گھٹا کر

ایک ہزار تک لے آؤں لیکن ایک بار بھی یہ سعی مشکور نہیں ہوئی۔

میں ارباب مشاعرہ پر اتنا بار ڈالنا پسند نہیں کرتا۔ اس لیے اس قدر وعدہ کرتا ہوں کہ میری کتابوں کی رائلٹی کا روپیہ اگر اس اثنا میں مل گیا، یا پٹیالہ سے میری چڑھی ہوئی پینشن جس کے باز اجرا کا اس وقت حکم نامہ آیا ہے، وصول ہوگئی تو میں خود اپنے مصارف سے مشاعرے میں شریک ہونے کی خاطر دہلی آؤں گا اور کنور صاحب کے دیدار سے مسرت حاصل کروں گا ـــــ ورنہ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ کنور صاحب کی خدمت میں میرا اسلام شوق کہ دیجے۔

نیاز مند
جوش

بخدمت گرامی رام پرکاش صاحب ساحر۔ ایم۔ اے
معرفت کنور مہندر سنگھ صاحب بیدی
سٹی مجسٹریٹ ، دہلی

(۲)

8, OLD AGHA KHAN
BUILDING,
HAINES ROAD,
JACOB CIRCLE
BOMBAY (11)

۱۹ مارچ ۱۹۴۸ء

مکرمی، تار بھی ملا اور خط بھی۔ افسوس کہ ابھی تک میرا روپیہ وصول نہیں ہوا ہے کہ اپنے ذاتی خرچ سے مشاعرے میں شریک ہوں اور نہ آپ کے موعودہ ان سو روپوں میں

اتنی طاقت پاتا ہوں کہ وہ میرے بارِ سفر کے متحمل ہو سکیں۔ اس لیے بے حد قلق ہے کہ میں مشاعرے کی شرکت اور کنور صاحب کی طلعت دونوں سے محروم رہوں گا۔

امید کہ مزاجِ گرامی بخیر ہوگا۔ یادآوری کا شکریہ قبول فرمائیے۔

نیاز مند

جوشؔ

(۳)

۱۰ر اکتوبر ۱۹۴۸ء

مکرمی، گرامی نامہ پہنچا۔ یادآوری کا بہت بہت شکریہ، مجھے، جیسا کہ زبانی کہہ چکا ہوں، تین ہزار کی ضرورت ہے، اس لیئے اگر آپ کو میری ضرورت کا احساس ہے تو براہِ کرم تین ہزار روپے جلد تر روانہ کر کے شکریے کا موقع دیجے۔

آپ نے آخری دن میرے دفتر آنے کا وعدہ کیا تھا اور میں اقرار نامہ لکھ کر آپ کا انتظار کرتا رہا، لیکن آپ تشریف نہیں لائے۔

بہ ہر حال اقرار نامہ تیار ہے۔ آپ، اگر فرصت ہو تو، مہربانی کر کے خود ہی آجائیں، تا کہ ضابطے کی خانہ پُری ہو جائے یا آپ مناسب سمجھیں تو اقرار نامے کی عبارت نقل کر کے وہیں بھیج دوں اور آپ اُسے ملاحظہ فرما کر واپس کر دیں۔

میں اس مہینے کی آخری تاریخوں میں دہلی سے باہر جا رہا ہوں، اس سے قبل ہی ہمارے دستخط ہو جائیں تو مناسب ہے۔

مکرّر یہ کہ مہربانی فرما کر کل روپیہ جلد سے جلد روانہ کر دیجے۔ امید کہ مزاجِ گرامی بخیر ہوگا۔

نیاز مند

جوشؔ

(۴)

۲۲ر اکتوبر ۱۹۴۸ء

مکرمی، خط اور ڈرافٹ مل گیا۔ دلی شکریہ قبول فرمائیے۔ میں مسودے کو عجلت کے ساتھ لکھ رہا ہوں اور غالباً زیادہ سے زیادہ ایک ہفتے عشرے میں مکمل کرکے آپ کے حوالے کر دوں گا۔

اقرار نامے کے واسطے میرے نزدیک اگر آپ ۲۷ اکتوبر تک یہاں تشریف لے آئیں تو مناسب ہے، اس لیے کہ میں یہاں سے ۲۸ اکتوبر کو روانہ ہو رہا ہوں۔

یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ ۲۹ اکتوبر سے ۳ نومبر تک لکھنؤ میں مجھ سے مل کر اقرار نامے کی کارروائی کو مکمل کر لیں۔

لکھنؤ میں میرا قیام بدری ناتھ روڈ۔ گولا گنج میں مرزا جعفر حسین صاحب ایڈوکیٹ اڈیٹر مون لائٹ کے مکان پر ہوگا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ آپ مندرجہ بالا پتے سے مجھے لکھنؤ خط بھیجیں اور میں چند گھنٹوں کے واسطے کانپور چلا آؤں۔

اس خط کا جواب، براہِ کرم، اسی وقت روانہ فرمائیے تاکہ مجھے پہلے ہی سے آپ کی مرضی معلوم ہو جائے۔

امید کہ مزاجِ گرامی بخیر ہوگا۔

نیازمند
جوشؔ

آپ کے پرچے پر ریویو کر دیا گیا ہے۔

دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ دفتر میں میرا بلاک نہیں ہے۔ تصویر گھر جاکر بھیج دوں گا۔ میں نے کنور صاحب کے متعلق ایک مختصر سی نظم کہی ہے، وہی اُن کے فوٹو کے ساتھ

شائع فرما دیجے۔

(۵)

ساحر صاحب، شیوراج بہادر نے سجّاد کو ٹکا سا جواب دے دیا۔ گویا دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک دیا۔ واقعی یہی چاہیے بھی تھا۔ اگر کنور صاحب کا مجھے لحاظ نہ ہوتا تو مشاعرے پر لعنت بھیج دیتا۔

ہزِ درویش بر جانِ درویش

نیاز مند
جوشؔ

۱۹۴۸ء

(۶)

۲۸ جولائی ۱۹۵۰ء

حضرتِ ساحرؔ، یاد آوری کا شکریہ اور بہ تاخیر جواب دینے کی معذرت قبول فرمائیے۔

آپ کا خط بتا رہا ہے کہ آپ کلکتے میں خوش نہیں ہیں جس سے اندیشہ پیدا ہو رہا ہے کہ کہیں آپ سب کام چھوڑ چھاڑ کر وہاں سے بھاگ نہ کھڑے ہوں۔

اگر آپ نے اس قسم کی طفلانہ جست و خیز کی تو یقین کیجیے کہ آپ کے تمام سنجیدہ احباب کو، جن میں قلعے والی ڈانٹ کے باوجود، میں بھی شامل ہوں، حد سے زیادہ صدمہ پہنچے گا، اور سب کو آپ کی دانش مندی سے مایوسی ہو جائے گی۔

ساز گار و خوش گوار حالات میں تو ہر شخص بسر کر لیتا ہے، لیکن جواں مرد ہیں وہ لوگ جو ناخوش گوار حالات میں سر جھکا کر زندگی بسر کرتے ہیں۔

اِس لیے میری نصیحت کان کھول کر سنیے اور انھیں تلخیوں میں زبردستی شیرینی پیدا

کر کے زندگی کا جہاز چلائیے۔

گوگو کو بہت پیار اور بیگم کو بہت بہت دعا۔

آپ کا ملازم کلکتے پہنچ گیا ہوگا۔ مجھ سے بہت اچھی طرح مل کر گیا ہے۔

بسمل صاحب نے رسائی حاصل فرمائی ہے، آخری حدود تک لیکن پھر بھی ڈیڑھ خمے حقّے کی طرح سر جھکائے رہتے ہیں۔ کون خوش کر سکتا ہے، ان قبرستانوں کے نوحہ گروں کو جن میں تحفظِ مسرت کا جوہر نہیں ہے اور جو اس کرۂ ارض کے امام باڑے کے تعزیے ہیں۔

نیاز مند
جوشؔ

(۷)

۲ر نومبر ۱۹۷۶ء قبل طلوع

پیارے دوست حضرتِ ساحر۔ آپ کا محبت نامہ، کاغذوں کے جنگل میں گم ہو گیا تھا۔ اس وقت خطوط کا ایک پرانا بنڈل کھولا تو برآمد ہوا۔

اس قدر تاخیر کے ساتھ خط لکھنے کی، معافی کا خواستگار ہوں۔ خط گم ہو جانے کا قلق اس لیے اور بھی شدید ہے کہ وقت پر کنور صاحب کے باب میں بھٹّو صاحب سے بات نہ کر سکا۔

ہائے، کنور صاحب آجاتے تو ہندوستان و پاکستان کس قدر قریب آجاتے اور میرا کلیجہ بھی ٹھنڈا ہو جاتا۔

اس دور افتادہ کو گاہ گاہ یاد کرتے رہا کیجیے۔

نیاز مند
جوشؔ

(۳۵۱) الف ۳/۶۔ اسٹریٹ (۹۰) اسلام آباد

یہ دوسرا پرچہ براہِ کرم کنور صاحب کو دے دیجیے گا۔

(۸)

۱۳؍فروری ۱۹۵۵ء

برادرِ عزیز، میرا سینہ آپ ہی کے مانند بے کینہ ہے۔ میں کسی سے مستقلاً عداوت نہیں پال سکتا۔

تھوڑی دیر کے واسطے بشری کمزوری کی بنا پر، میں کسی شخص سے اُس کی بے وفائی یا کمینگی کے باعث ناخوش تو ضرور ہو سکتا یا ہو جاتا ہوں، مگر اُس ناخوشی کو اپنے دل میں پرورش دینے کی تاب نہیں لا سکتا۔

آپ جانتے ہیں کہ شاہ جہاں پوری بسمل نے میرے خلاف سفلگی کا جو مظاہرہ کیا تھا، میں اُسے دل سے معاف کر چکا ہوں اور دو ایک مشاعروں میں، جہاں میرے مشورے سے لوگ مدعو کیے گئے تھے، بسمل کو بھی مدعو کرا چکا ہوں، لیکن ہر مشاعرے میں میرا اور پورے مشاعرے کا عینی مشاہدہ ہے کہ یہ بسمل میرے خلاف اشعار پڑھتا ہے، اور میری جانب زور زور سے ہاتھ اٹھا کر اور منھ بنا بنا کر اشعار پڑھتا ہے۔

ظاہر ہے کہ اُس کی اس سفاہت سے میرا نہ کچھ بگڑتا اور نہ بگڑ سکتا ہے۔

لیکن مجھے اپنی بشری کمزوری کی بنا پر چوں کہ یہ خیال ہے کہ میں بپے ہوتا ہوں کہیں ایسا نہ ہو کہ میری طبیعت قابو سے باہر ہو جائے اور مشاعرے والے تماشا دیکھیں۔

اِس لیے میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ میں بسمل کے ساتھ کسی مشاعرے میں یک جا نہیں ہوں گا۔

البتہ اگر آپ بسمل سے یہ وعدہ لے لیں کہ آئندہ وہ ایسی حرکتوں کا ارتکاب نہیں کرے گا اور وعدہ لے کر مجھ سے قطعیت کے ساتھ فرمادیں کہ بسمل تہذیب سے بیٹھے رہنے کی قسم کھا چکا ہے تو میں بڑی خوشی سے بسمل کے ساتھ مشاعروں میں شریک ہوا کروں گا۔

مجھے بسمل یا بسمل کی قسم کے آدمیوں سے کوئی شکایت پیدا ہو ہی نہیں سکتی، لیکن آپ سے ضرور شکایت کروں گا کہ آپ نے بسمل کی چھچھوری حرکتوں کا بارہا معائنہ فرمایا لیکن اُسے تنبیہ نہیں کی اور میری اہانت کے سلسلے کو جاری رہنے دیا۔

یہ امر دوستی ہی نہیں، آدمیت کے بھی خلاف ہے۔

نیاز مند
جوشؔ

سفاہت

مولانا ابو الکلام آزاد

حضرت مولانا آزاد،

صرف پانچ منٹ کے واسطے شرف نیاز حاصل کرنا چاہتا ہوں، کس روز اور کس وقت حاضر ہوں؟

جوش

ساغر

جمیل جالبی

۶ نومبر ۱۹۶۴ء

جمیل میاں، آپ نے آنے کا وعدہ کیا تھا لیکن حسبِ دستورِ قدیم آئے نہیں۔ خیر اللہ خوش رکھے۔

یہ میرا کم بخت سارٹی فکٹ ایک مدت سے نامکمل پڑا ہوا ہے، آپ کے ہوتے ہوئے اور اس قدر تاخیر، یہ بھی میری تقدیر، آپ ہیں بے تقصیر۔

اب LIKE A GOOD BOY اس پر، جلد تر، دستخط کرا کے بھیج دیجیے۔ میرا ایک نہایت ضروری اور عجلت طلب کام رُکا پڑا ہے۔ اللہ آپ کو توفیق عطا فرمائے میرے پاس آنے کی۔

مخلص

جوشؔ ملیح آبادی

میکش اکبرآبادی

(۱)

بنارسی باغ لکھنؤ

۷ مئی، ۱۹۴۱ء

مخلص، یادآوری کا شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں، اس لیے کہ محبت کی نزاکت رسمیات کا بار نہیں اٹھا سکتی، اس طرح جواب میں تاخیر ہوجانے کی معذرت خواہی بھی فضول ہے، اس وجہ سے کہ روزی وقت کی پابندی نہیں ہوسکتی۔ (کذا)

میکش صاحب! ہمارے آپ کے راستے کسی قدر ایک دوسرے سے جدا اور ہماری زندگیاں کس درجہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں مگر یہ عجیب بات ہے کہ ہم ایک دوسرے کی طرف کھیچنے پر اپنے کو مجبور پاتے ہیں اور ایک دوسرے کو عالمِ تصور کے روحانی دھندلکے میں محوِ خرام دیکھا کرتے ہیں۔ میں دل میں آپ کے خط آنے سے دو تین روز پیشتر یہ کہہ رہا تھا کہ یہ میکش بھی عجیب شخصیت کا مالک ہے جو فرصت کے لمحوں میں میرا تعاقب کرتا رہتا ہے۔ شاید آپ اس وقت مجھے خط لکھ رہے ہوں گے اور اسی کی لہریں میرے دل سے مَس ہو رہی ہوں گی۔

مدت سے آگرے آنے کو جی چاہ رہا ہے، وہاں کے در و دیوار آنکھوں کے نیچے پھرا کرتے ہیں اور بعض اوقات تو پَر لگا کر اڑ جانے کی آرزو کرنے لگتا ہوں مگر حالات کی عدمِ مساعدت اُٹھنے تک کی اجازت نہیں دیتی۔

گرمی یہاں شدت کے ساتھ پڑ رہی ہے۔ اس وقت بھی جب کہ شام کا وقت قریب

ہے، پسینے میں نہایا ہوا بیٹھا ہوں اور سخت بے کیفی کے عالم میں خط لکھ رہا ہوں. کشمیر جانے کا ارادہ ہے مگر کون کہہ سکتا ہے کہ "پروردگارِ عالم کی رحمتِ کامل" سازو برگ مہیا بھی ہونے دے گی کہ نہیں. ایک میرے مکان کے سامنے کی زندہ عجائب گھر کی سرا کائے ہے جو پہاڑ جا چکی ہے اور ہر سال جایا کرتی ہے. ایک ہم گناہ گار بندے ہیں جو لکھنؤ کی گرمی میں جلنے اور گلنے پر مجبور کر دیے گئے ہیں۔

سو سال اگر خزاں کے تو دو دن بہار کے
قرباں ہجومِ رحمتِ پروردگار کے

آپ کا
مرحوم جوشؔ

(۲)

دہلی.

۱۱ نومبر ۱۹۲۸

برادرِ ذہنی، رفیقِ روحانی! کس قدر پُر مغز عبارت ہے خط کی اور محبت کے نازک پہلوؤں پر کس قدر اختصار آمیز روشنی ڈالی ہے، مگر یہ باتیں آپ کو معلوم ہوئیں کہاں سے؟ بسم اللہ کے گنبد کے اندر یہ رباب بجانا کس سے سیکھا ہے. یہ تو "کرتے کی رویا ہے"، آپ نے نظری طور سے محبت کے بھید کیوں کر معلوم کر لیے ؟

ممکن ہے اس پردۂ زہد و ورع کے پیچھے کوئی کافر ادا تبسم ریز رہا کرتی ہو، کسے معلوم، آپ ہی روشنی ڈالیں۔

میرے حالات نہ پوچھیے. سر چکرانے اور دل دھڑکنے لگا. صرف اس تصور سے کہ اب تک سانس لے رہا ہوں۔

دلِ برباد کی اس حد ہے خرابی کہ نہ پوچھ
جانا جاتا ہے کہ اس راہ سے لشکر گزرا (میرؔ)

بس۔ الحفیظ والاماں۔ میرے سینے کے اندر بادل گرج رہے ہیں۔ خوف ناک بادل۔ طوفانی بادل۔

جوشؔ

ذرا غور تو کیجیے میری حالت پر، فکرِ معاش بھی ہے، غمِ عشق بھی ہے اور تمنائے معرفت بھی ہے۔ تقدیر نے برباد کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ اپنے تمام حربوں کے ساتھ حملہ آور ہو رہی ہے، اگر میں اس طوفان میں قائم رہا تو نپولین اور سکندر کی عظمتیں میرے پاؤں چومیں گی۔

(۳)

دہلی
۴ر نومبر ۱۹۴۵ء

برادر مکرم۔ سلام علیکم

رسالہ اب انشاء اللہ ہفتے عشرے میں شائع ہو جانے والا ہے۔ کچھ پوسٹر اس غرض سے بھیجے جا رہے ہیں کہ آپ انھیں وہاں مناسب مقامات پر اس طرح چسپاں کرا دیں کہ عام طور پر لوگوں کی نظر سے گزر جائیں

تکلیف دہی کا معافی خواہاں
جوشؔ

(۴)

دہلی۔

۹ر جون ۱۹۳۶ء

مخلص، کیا آپ کی خدمت میں بھی یاد دہانیوں اور درخواستوں کی مجھے ضرورت ہے؟ آپ، اور "کلیم" میں مہینوں کوئی نظم یا مقالہ روانہ نہ فرمائیں۔ کتنی عبرت ناک بات ہے۔

شاید آپ کسی بے نیاز قوت سے دوچار ہو چکے ہیں، ورنہ اس درجہ بے نیازی کا برتاؤ کبھی نہ کرتے۔

اب ایک فرماں بردار لڑکے کی طرح ایک ہفتے کے اندر نظم یا مقالہ روانہ کیجیے، ورنہ درحقیقت مجھے سخت قلق ہو گا۔

آپ کا
جوشؔ

(۵)

۱۵ر جون ۱۹۵۴ء

حضور والا! اس اثنا میں گرمی اور مشاغلِ بیہم کی بنا پر آپ کے گرامی نامے کا جواب دہلی سے وقت پر نہ دے سکا۔ اس لیے خط کے شکریے اور بہ تاخیر سے جواب دینے کی معذرت کو دوش بہ دوش قبول فرمائیے۔

ذرا اکاڈمی "چالو" ہو جائے تو اُن گوشوں پر نظر پڑ سکے گی، جہاں سے آپ کے خدمات حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

آپ مطمئن رہیں، میں اس خیال سے غافل نہیں رہوں گا۔

یہ خط آپ کو، شاید جے پور میں ملے گا، وہاں ملے تو اپنے بھائی سے میرا سلام کہہ دیجیے گا، اور بن پڑے تو خیری صاحب سے یہ امر دریافت کر کے مطلع فرمائیے کہ میں اپنی جاگیر کے سلسلے میں، جے پور کب آؤں۔

ذرا اِس رباعی کے تیور ملاحظہ فرمائیے:

اِک قہرِ خدا یہ نازنیں ہے اے دِل
باز آ کہ بہت سخت حسیں ہے اے دِل
یہ برق کا سیل، چاندنی کا گرداب
اُف، ناقابلِ برداشت نہیں ہے اے دِل

یہاں شملے میں آج کل بڑی بہار ہے۔ حسینوں کا ہجوم قطار در قطار ہے۔ مال روڈ کی مال زادیوں نے وہ دھماچوکڑی مچا رکھی ہے کہ ہر ران کے درمیان ایک آگ لگا رکھی ہے۔ شانوں سے شانے چھلتے ہیں، نیم ہم آغوشی کے مزے ملتے ہیں۔

کاش آپ بھی یہاں ہوتے۔ مگر آپ!! زمہریری انسان، آپ تو برف ہیں برف اور ایسی برف جو شورح کے شرنیوں میں بھی دب کر نہ پگھلے۔

آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ وہ لوگ جو صرف شرعی اور حلالی بچے پیدا کرتے ہیں۔ فلسفیانہ نقطۂ نظر سے قطعی نامرد ہوتے ہیں۔

بارادتِ فراواں
جوش نَوَّرَ اللہُ مَجلِسہٗ

بخدمتِ گرامی یکے از مردانِ یک زنی و محروم الزنا حضرت میکش مرشدنا

کلیم

مدیر جوش ملیح آبادی

دہلی ۹

[illegible]

اعجاز صدیقی

۴ ستمبر ۱۹۵۳ء

عزیزی،

یہ ہرگز خیال نہ کیجیے گا کہ میں دیرینہ مراسم کو بھول گیا ہوں۔
خطوط کے جواب میں عدیم الفرصتی کی بنا پر البتہ کوتاہی ہو جاتی ہے جو قابلِ معافی ہے۔
اپنی خیریت سے گاہ گاہ مطلع کرتے رہیے۔ ایک تازہ ترین نظم روانہ کر رہا ہوں۔
میری بہترین آرزوئیں آپ کے ساتھ ہیں اور ہمیشہ رہیں گی۔

نیاز مند
جوشؔ

سعیدہ خاتون

(۱)

۲۸- جون ۱۹۲۳ء کو جوشؔ نے شانتی نکیتن سے ایک خط میں لکھا ہے:

"دکھیا باپ کا خط اس کی ہفت سالہ لڑکی کے نام"

سعیدہ پیاری! میں نے تیری ماں کا خط پڑھا.... جس میں لکھا تھا کہ تیرے پاس اب کپڑے بھی نہیں رہے۔ گرمی کی شدت ہے اور موٹے کپڑے پہنتے وقت تو رونے لگتی ہے۔

آہ تیرے باپ کی بے کسی ___ اب وہ اپنی لاڈلی بیٹی کو گرمیوں کا لباس بھی نہیں پہنا سکتا۔!

بیٹی، یہ خبر پردیس میں تیرے باپ نے سُنی .... عین اس عالم میں کہ فکریں اس کے دل کو سانپ کی طرح ڈس رہی تھیں .... اور وہ گھبرایا ہوا تھا۔.....

خط پڑھتے پڑھتے رونے والی آنکھوں سے دو آنسو چلے اور کاغذ پر ٹپک پڑے۔

پیاری سعیدہ! تیرا مصیبت زدہ باپ یہ دُکھ بھول نہیں سکتا۔ اس خبر کا داغ اس کے ساتھ قبر میں جائے گا۔

سُن، تیرا باپ وصیت کرتا ہے کہ اس مبارک دن جب وہ مرجائے

تیری اس خراب پوشاک کی یاد میں اسے ایسے ہی کپڑے کا کفن دیا جائے۔

(۲)

اسلام آباد

۲۳-۱-۷۳

کلوؓ، تم پریشان نہ ہو..... میں اچھا ہوں، کچھ معمولی سی شکایتیں ہیں۔ سو دور ہو جائیں گی۔ جب سے گئی ہو، ایک خط بھی نہیں لکھا۔

یہاں آج کل موسم نہایت شدید ہے۔ آج کئی روز کے بعد سورج نکلا تھا مجھ کو لڑکی اور لڑکے، دونوں کی طرف سے دُکھ ہے۔ جیسی چاہیے، تم دونوں کی ویسی مدد نہیں کر سکتا۔

میری اشرفؒ جہاں کیسی ہیں۔ اللہ انھیں تن درست کر دے اور سلامت رکھے۔ قلندرؒ رے اور کپٹیؒ کیسے ہیں۔ بوٹیؒ کے بچے، بیوی کو ستاتے تو نہیں۔ اچھا بھئی خدا حافظ۔ شام کا وقت، اور پونے چھے بج چکے ہیں۔ اب میں اپنی عبادت میں مشغول ہوتا ہوں۔

یہ ضرور لکھو کہ میّاںؒ کب آرہا ہے اور کوئی شادیؒ کی تاریخ ٹھہری ہے کہ نہیں۔ بلّو کا بی بی کو سلام اور اماں آپ کو بھی۔

تمھارے اور اشرف جہاں کے بغیر
اُوبھ اُوبھ کر جینے والا
جوشؔ

(۳)

۳۰۸۔ ایف

اسلام آباد

۳۱۔۱۰۔۷۳ رات کے ایک بجے

سعیدہ بیٹیؒ، ایک طرف تو سجّاد کی بے اصول زندگیؒ اور صحت کی خرابی ہے۔ دوسری

طرف تمہاری ماں کی ناتوانی اور دائمی بیماری ہے، تیسری طرف تمہاری صحت کا تزلزل ہے۔ چوتھی طرف یہ صدمۂ جانکاہ کہ میری آمدنی اس قدر کم ہے کہ میں اپنی بیٹی اور اپنے بیٹے کی حسبِ آرزو مالی مدد نہیں کر سکتا ـــــ اور پانچویں طرف یہ غم کہ تمہارے لڑکوں نے تعلیم حاصل نہیں کی، اور اُن کو کس مد میں کھپاؤں۔ اور میرے بعد ان کا حشر کیا ہوگا۔

میری ایک جان ہے، اور اتنے روگ ہیں۔ میری دانش مندی مجھ کو بہلائی رہتی ہے، ہنستا بولتا ہوں لیکن گھن لگا ہوا ہے دل میں ــــ جاگتے سوتے ضربیں لگتی رہتی ہیں میری جان پر۔

رئیسؔ نے بھی مجھ سے منھ موڑ لیا۔ کاش وہ میری لاش پر روتا۔ ہائے میرا محبوب بھائی مجھ سے بچھڑ گیا اور میں نامراد مرنے کا نام ہی نہیں لیتا۔

میری بشاشتوں، میری سرور طلبیوں اور میرے قہقہوں سے دھوکا نہ کھا بیٹھی۔ میں اندر سے اس قدر زخمی ہوں جس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔

سرسبز ہوں بظاہر، باطن میں خون ہے دل

تمہاری ماں کی عدم موجودگی نے اور بھی اداس کر رکھا ہے۔ درو دیوار سے رونے کی صدا آتی ہے۔ میاں کو شادی کے عذاب میں کب مبتلا کر رہی ہو۔ مہینے اور تاریخ سے آگاہ کرو تاکہ اس بہانے کراچی آؤں اور تم کو تمہاری ماں اور چھوٹے لڑکوں سمیت یہاں لے آؤں، تاکہ میرا گھر آباد ہو جائے اور قلندرؔ اور کُبّیؔ، اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے قابل ہو جائیں، یاد رکھو اگر یہ دونوں بچے کراچی میں رہے تو سو فی صد تباہ ہو کر رہ جائیں گے۔ کاش ان میں عقل آئے۔

علیؔ کی نوکری طے ہو چکی تھی۔ تم نے تار بھیج کر بلا لیا۔ میں نے یہ سوچ کر اسے جانے دیا کہ تم وہاں اکیلی ہو، ڈھارس ہو جائے گی۔ میں نے تمہاری پریشانی کا خیال کیا اور اس کے مستقبل کی پرواہ نہیں کی، یہ ہیں محبت کی نادانیاں اور ستم رانیاں۔

بیٹی! اپنے بھائی کو بھی آمادہ کرو کہ جب میں تم سب کو یہاں لے آنے کے واسطے کراچی آؤں وہ بھی میرے ساتھ چلا چلے، تاکہ اس کا حسبِ منشا علاج کر سکوں

اور جب مر جاؤں تو میرا سارا کنبہ، میرے سرہانے بیٹھا ماتم کر رہا ہو۔
عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

٭ ٭ ٭

اب روئے سخن پھیرتا ہوں سجاد کی طرف۔

میرے بیٹے، میرے پاس آکر رہو، میری تنہائی پر رحم کرو، جب تمھیں یاد کرتا ہوں، دل سے خون کی بوندیں ٹپکتی ہیں۔ بیٹا تم اس قدر بے رحم کیوں ہو گئے ہو کہ باپ کی معیت سے جی چُراتے ہو اور کراچی میں پڑے ہوئے خود کو بھی گھلائے ڈال رہے ہو۔ خدا کے واسطے میری پکار سنو اور میرے آغوش میں آجاؤ۔"

قلندر اور کبھی کراچی تم کو تباہ کر کے رکھ دے گی، بچو! یہاں آجاؤ، میں تمھاری تعلیم کا ایسا بندوبست کر دوں گا کہ تم میں جینے اور جلانے کی طاقت پیدا ہو جائے گی، دیکھو، میری بات نہیں مانی تو آئندہ سر پکڑ کر رہ جاؤ گے۔

شہناز بیٹی، تمھارا خط ملا، کل تمھاری ماں کہہ رہی تھیں کہ وہ تم کو پنڈی بلالیں گی میری رائے بھی یہی ہے کہ تم بنّے کے آنے تک ماں ہی کے پاس رہو۔

سعیدہ بیٹی! اپنی ماں کو بڑے پیار سے رکھنا، بیٹی کا سا نہیں ماں کا سا برتاؤ کرنا، ان کی جھڑکیاں سننا اور مسکرانا۔

ہائے میری اشرف جہاں، اللہ تم کو سلامت رکھے اور بیوگی کے بعد بھی تم آرام و عزت سے رہو۔ میری شاہانہ مزاج کی تند خو اور میری جیسی باوفا بیوی۔ لوٹی اور عزیز سے میری دعا کہو اور ان کے بچوں کو میری طرف سے پیار کر لو۔ سجاد کے بچوں تک بھی میری دعا پہنچا دو۔ اور بچی سے کہو، تیرے خط کا جواب دوں گا۔ انور سے بھی میری دعا کہہ دینا اور ہاں ناصر و نور سے بھی میری بہت بہت دعا کہہ دینا۔

تمھارا بظاہر بشاش اور بباطن افسردہ باپ
جوش

ہلکے ہلکے اشارے

دیوان سنگھ مفتوںؔ

"ارے بھائی کیا پوچھتے ہو کیسی گزر رہی ہے۔ آپ کو یاد ہوگا تقسیم سے قبل مسز نائیڈو نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر ملک تقسیم ہوگیا تو آپ کا بہت بُرا حشر ہوگا۔ ہندوستانی ہندو آپ کو مسلمان سمجھ کر قابلِ نفرت سمجھیں گے اور پاکستانی مسلمان آپ کو کافر سمجھ کر قابلِ قتل خیال کریں گے، تو بھائی ایک ایک حرف پورا ہوا اس پیش گوئی کا۔ شکرِ خدا کہ آج یہ دونوں ملک میرے خلاف شور مچا رہے ہیں۔

کہاں لے جاؤں دل دونوں جہاں میں سخت مشکل ہے
ادھر پریوں کا مجمع ہے اُدھر حوروں کی محفل ہے

تو جنابِ والا ہم تو اِن "پریوں" اور ان "حوروں" کے نرغے میں گھرے ہوئے ہیں۔ کہاں لے کے جیہو رام یہ جلبی نینا؟ جانتے ہیں حضورِ والا کہ میرا قصور کیا ہے۔ صرف اس قدر کہ میرے دل میں یہ خیال کیوں آیا کہ میرے انتقال فرما جانے کے بعد میری بیوہ اور میرے بچّوں کا حشر کیا ہوگا اور یہ سب ہندوستان ہی میں رہیں گے تو ان کی زبان اور ان کی کلچر کیوں کر باقی رہ سکے گی۔ بس لے دے کے میرا ایک جرم ہے اور اِن اللہ کے بندوں کی نگاہ میں یہ ایک اس قدر سنگین جُرم ہے کہ اُسے معاف ہی نہیں کیا جا سکتا۔ کاش میں صاحبِ اہل و عیال نہ ہوتا۔ مجھ نامُراد کو یہ کیا معلوم تھا کہ یہ میرے

سر پر سہرا نہیں باندھا جا رہا میری شخصیت کی قبر پر چادر چڑھائی جا رہی ہے۔ افسوس کہ آسمان پر اڑنے والا زمین کی زنجیر میں جکڑا ہوا پڑا ہے۔

خیال د مال نے روکا ہے دم کو آنکھوں میں
یہ ٹھگ ہٹیں تو مسافر کو راستہ مل جائے

اب میں، اے میرے پرانے دوست آپ کی خدمت میں یہ التجا کرتا ہوں اور شاید یہی میری آخری التجا ہو گی کہ آپ کل صبح کے وقت اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کریں کہ وہ اب مجھے اس دنیا سے اُٹھا لے۔"

منظر صدیقی

دہلی

۲ر دسمبر ۱۹۵۱ء

منظر صاحب

یہ تعزیتی خط نہیں بلکہ وہ خون کی بوند ہے جو آپ کے محترم والد، ملک کے گرانقدر شاعر اور اپنے دیرینہ دوست علامہ حضرت سیمابؔ کی وفات پر دل سے بے اختیار ٹپک پڑی ہے۔

یہ میرا کم بخت دل جو پرانے دشمن کی موت پر بھی دھڑک سکتا ہے اپنے پرانے دوست کی موت پر کیوں کر صبر کر سکتا ہے؟

میں اس عظیم سانحہ پر جب خود آنسو بہائے بغیر نہیں رہ سکتا آپ کو تلقینِ صبر کیوں کر سکتا ہوں۔

روئیے اور جی بھر کر روئیے کہ رونا ہی زندگی کا عنوان، آغاز اور انجام ہے۔ دیکھیں سفاک موت آدمی کے ساتھ کب تک یہ کھیل کھیلے گی اور نہ جانے وہ زمانہ کب آئے گا جب انسان خود موت کا گلا گھونٹ دے گا۔

۱۹۵۰ء کا آخری اور ۱۹۵۱ء کا ابتدائی حصہ اردو ادب کے واسطے کتنا منحوس ثابت ہوا، کتنی شمعیں اس دور میں گل ہو گئیں۔ موت نے کس قدر جلد جلد اربابِ کمال کو پکارا۔ بھائی اب جوشؔ

بھی گوش بر آواز ہے۔ ایک ایک کر کے لوگ اُٹھتے چلے جا رہے ہیں۔ اب جی کر کیا کروں گا
تنہائی کے شدائد نے بدحواس کر رکھا ہے۔ مرنے والوں کی آوازیں بُلا رہی ہیں۔

یاں چمپئی دھوپ ہے، گلابی سایا
رہتا ہے سحابِ ابدّیت چھایا
جوشؔ آؤ کہ منتظر ہے بزمِ ارواح
آیا، یارانِ رفتہ آیا، آیا

سوگوار
جوشؔ

ڈاکٹر سید مسعود حسن رضوی ادیب

(۱)

۱۷ستمبر ۱۹۳۵ء
دھول پور

برادرِ مخلص،

مضمون پہنچا، دلی شکریہ قبول فرمائیں۔ میں آپ کے مشوروں پر انشاءاللہ ضرور عمل کروں گا۔ پرچے کے نام کے متعلق بھی غور کر رہا ہوں۔

براہ کرم دوسرے نمبر کے لیے اگر کوئی حکیمانہ مقالہ یا ہندو مسلم اتحاد پہ کوئی مضمون تحریر فرمائیں تو زیادہ مناسب ہے۔

مجھے آپ کی اخوت سے یقین ہے کہ اپنے گراں قدر مضمون سے رسالے کے کسی نمبر کو بھی محروم نہ رکھیں گے۔

آپ کی عنایت کا مکرر شکریہ۔

نیازمند
جوشؔ

(۲)

نومبر۵۳ ۱۹ء
کلیم دہلی

مدیر جوش ملیح آبادی

شفیقِ محترم! آپ کا گراں قدر مقالہ اسی مہینے میں شائع ہو رہا تھا مگر بدقسمتی سے

عین وقت پر اس کی کاپی خراب ہوگئی، اس لیے اب مجبوراً نومبر میں شائع ہوگا۔ یہ اس لیے لکھ دیا کہ آپ کہیں دوسری جگہ مضمون نہ بھیج دیں۔

نیاز مند
جوشؔ

(۳)

دہلی۔

۲۱ / اپریل ۱۹۳۶ء مدیر جوشؔ ملیح آبادی

افسوس کہ آپ نے اب تک "کلیم" کو کوئی مضمون نہ بھیجا۔ یہ ہے یگانوں کا سلوک۔ غیروں سے اب کیا گلہ کر سکتا ہوں

آپ کا
جوشؔ

(۴)

دہلی۔ کلیم مدیر جوشؔ ملیح آبادی

۳ / دسمبر ۱۹۳۷ء

مکرمی!

یاد آوری اور بیانِ مقالہ نگاری کا شکریہ قبول فرمائیں۔
میں دسمبر کے مہینے میں ہمہ تن چشم انتظار رہوں گا
اُمید کہ مزاجِ گرامی بخیر ہوگا

نیاز مند
جوشؔ
دین دیال روڈ
لکھنؤ

شیخ غلام قادر گرامی

قبلۂ محترم۔

سلام مخلصانہ قبول فرمادیں۔ آپ کا ۳۱ جولائی ۱۹۲۴ء کا گرامی نامہ مجھے آج ۹ مارچ ۱۹۲۵ء کو ملا۔ بات یہ ہے کہ میں ایک زمانۂ دراز سے حیدرآباد میں ہوں اور ڈاک کا دو چار مہینے اُدھر تک نہایت ابتر انتظام رہا ہے۔ کل اتفاق سے ملیح آباد کا ایک بکس جو تازہ آیا ہوا ہے کھولا اور اس میں آپ کا خط ملا۔ جسے میرے گھر والوں نے اپنی غفلت کے بکس میں ڈال رکھا تھا۔

کیا عرض کروں مجھے یہ خیال کر کے اس وقت کتنی سخت تکلیف ہے کہ آپ نے میری خاموشی کا کیا اثر لیا ہوگا — اللہ اللہ وہ گرامی جس کی زیارت کا میں ایک زمانے سے مشتاق ہوں اور جس کے کلام پر میں پہروں سر دُھنتا ہوں' وہ خط لکھے اور مجھے وہ خط مہینوں کے بعد ملے۔

میری عقیدت کا آپ کو میرے ایک بہت پُرانے مقطعے سے اندازہ ہوگا جو میں نے آپ کی اور اقبال کی یاد میں کہا تھا: ؎

زمانہ دیکھیے پنجاب کب لے جوش پہنچائے
بہت سے شور سے کرنے ہیں اقبال و گرامی سے

مجھے اس بات کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ آپ نے اس بے تکلفی کے ساتھ مجھے آموں کے واسطے تحریر فرمایا لیکن ملال ضرور ہے کہ وی۔ پی کی فرمائش کی۔ اگر آپ وی پی کے واسطے تحریر نہ فرماتے تو اس سے بھی زیادہ آپ کا ممنون ہوتا اور یہ کہ ایک پُرانے زمانے کے خلوص کی نہایت

درخشاں مثال بھی ہوتی۔ تاہم آپ اس کا یقین فرمائیں کہ میں اس فرمائش کے واسطے بہت ممنون ہوں۔

آپ کی رباعیوں کے متعلق میں کچھ عرض نہیں کر سکتا۔ در اصل یہ مجھ ایسے پست درجے کے آدمی کی تعریف سے مستغنی ہے۔ میں آپ کے ایک ایک حرف کو حرزِ جاں سمجھتا ہوں۔ پروردگارِ عالم آپ کو زمانۂ دراز تک تندرست و برقرار رکھے۔ ع

در پہلوے مرگ زندگانی کردیم

سبحان اللہ، سبحان اللہ، بخدا تعریف کے لیے الفاظ نہیں ملتے۔ اب چوں کہ مجھے جناب سے خط و کتابت کی سعادت میسر آگئی ہے اس لیے میری تمنّا ہے کہ گاہ گاہ خیریتِ مزاج سے مطلع فرمایا کیجیے۔

نیاز مند

جوشؔ

راس مسعود

(۱)

باڑہ نواب صاحب ۔ دھول پور ۔ ۴ مارچ ۱۹۳۵ء

اخیٔ المحترم

ہات میں اس وقت رعشے کی سی کیفیت ہے، اور یہ بھی میرے دل کی طرح ٹوٹی سی ہے، پھر بھی صاف لکھنے کی کوشش کروں گا۔

میرے حالات سے آپ کو کسی نہ کسی حد تک واقفیت ہو چکی ہوگی، جس کی تفصیل لاحاصل ہے، آپ کے سے حساس انسان کے لیئے موجودہ حالات میں میرے اور میرے متعلقین کی بے پایاں دردمندیوں کا اندازہ لگالینا آسان ہے۔

اگر تنہا ہوتا تو پروا بھی نہ کرتا، بال بچوں کا ساتھ ہے، اور زندگی کا میدان سامنے ہے۔

مجھ میں زیادہ لکھنے کی طاقت نہیں، طاقت جواب دے رہی ہے، درخانہ اگر کس است یک حرف بس است ۔۔ کیا آپ میری مدد کر سکتے ہیں؟ اور کیا میں آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر خود اپنے حالات بیان کر کے آپ کی مدد، یا کم سے کم مشورے سے بہرہ مند ہو سکتا ہوں ۔ ؟

خدا کرے آپ اس عالمِ شر میں خیریت سے ہوں۔

بچے آداب گزار ہیں

نیازمند

جوش

(۲)

دھول پور اگست ۱۹۳۵ء

مکرمیٔ "کاخِ بلند" کے نام سے، جیسا کہ آپ کو رسائل و اخبارات سے معلوم ہوا ہوگا، میں

دہلی سے ایک معیاری ماہنامہ جاری کرنا چاہتا ہوں۔ مفلس ومحکوم ہندوستان میں طبقۂ اعلیٰ کے ادیب شاعر اس قدر کم ہیں کہ انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں جن میں آپ کی ذاتِ گرامی بھی ہے۔

اور اسی بنا پر آپ کو ان چند سطور کے مطالعہ فرمانے کی زحمت دی جا رہی ہے۔ امید کہ آپ معاف فرمائیں گے۔

مجھ سے زیادہ آپ کو اس کا علم ہوگا کہ ہندوستانی زبان، ہندوستانی تہذیب و تمدن، ہندوستانی ذہنیت یا یوں کہیے کہ ہندوستانی رُوح کو اس وقت صحیح رہنمائی اور زبردست انقلاب کی اتنی شدید ضرورت لاحق ہے کہ ملک کے ہر حسّاس صاحبِ قلم پر فرض ہو چکا ہے کہ وہ اپنے وقت کا ایک معقول حصہ رسائل واخبارات کے لیے وقف کر کے قوم کی ذہنی تربیت اور رائے عامہ کی اثر آفرینی کا فریضہ ادا کرے۔

تاریخ شاہد ہے کہ اُس وقت تک کسی قوم میں بیداری و زندگی پیدا نہیں ہوئی ہے جب تک اُس کے ادبیات میں عظیم انقلاب پیدا نہیں کیا گیا ہے، اور ظاہر ہے یہ انقلاب کہیں باہر سے نہیں آتا، اسی ملک کے مشاہیر اُسے پیدا کرتے ہیں۔

اِسی نقطۂ نگاہ سے "کاخِ بلند" کا یہ ایک غیر متزلزل اصول رہے گا کہ اُس کے صفحات صرف اکابر و مشاہیر کے لیے مخصوص رہیں گے، یا اُس جوان قلم طبقے کو شریک کیا جائے گا جس کے تیور

می تافت ستارۂ بلندی

کے مصداق ہوں گے۔

یہ امر اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیے کہ آپ کے مستقل ومتصل تعاون کے بغیر رسالہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ اگر آپ نے اعتنا نہ فرمایا تو میری یہ انتہائی بد بختی ہوگی کہ جس جماعت کے بھروسے پر میں یہ اہم ذمّے داری اپنے سر لے رہا ہوں، اور جس طبقے کی ترجمانی کی خاطر میں اپنی باقی زندگی وقف کر دینے کا فیصلہ کر چکا ہوں، وہی میرا ساتھ نہ دے۔

آخر میں نہایت خلوص کے ساتھ آپ کی جناب میں استدعا کی جاتی ہے کہ سرِ دست "ڈمی" یعنی نمونے کے پرچے کے واسطے جو وسطِ اکتوبر تک شائع ہوگا، آپ ازراہِ معارف نوازی، اپنا گرانقدر مضمون / کلام ایک ہفتے کے اندر مرحمت فرما کر جذبۂ شکر گزاری کے ساتھ ساتھ، مجھے اس

اطمینان بخش احساس سے بھی لطف اندوز ہونے کا موقع دیجیے کہ میری قوم کے ارباب جوہر مجھ سے تعاون پر تیار ہیں۔

دوسری درخواست یہ ہے کہ مندرجۂ ذیل ابواب میں سے دو ایک باب اپنے واسطے مختص فرما کر ایک مقالہ ہر ماہ مرحمت فرماتے رہیئے۔

یہ عرض کر دینا بھی مناسب خیال کرتا ہوں کہ ہندوستان کے کروڑوں افراد میں سے صرف چند مخصوص حضرات کی خدمت میں یہ تحریر روانہ کی جارہی ہے۔ اگر اس طبقے نے مجھے مایوس کر دیا تو میں یہ فیصلہ کر کے، ہندوستان ہنوز ایسے سنجیدہ مضمونوں کے واسطے تیار نہیں ہے۔ اجرائے رسالہ کا خیال ہی ترک کر دوں گا۔

اس تحریر کے مطالعہ فرمانے کا شکریہ

فہرست ابواب پشت پر ۔ نیاز مند

یہ فہرست عبدالماجد دریابادی کے نام خط میں نقل کر دی گئی ہے۔ جوش

دھولپور ۱۰ ستمبر ۱۹۳۵ء (۳)

اخی محترم

حضرت ملا رموزیؔ[۴] کے خط سے معلوم ہوا کہ میرا تازہ ترین خط بھی آپ کو نہیں ملا، میری بدقسمتی اور محرومی کی یہ انتہا قابلِ عبرت ہے کہ اس آٹھ مہینے کی مدت میں کم سے کم میں نے چار خط تو ضرور آپ کی جناب میں ارسال کیے، لیکن آپ کو ایک بھی نہ ملا۔ کیا انسان قایل ہو جائے کہ اس کارخانۂ عالم کے پسِ پردہ کوئی ایسی قوت کام کر رہی ہے جو ہمارے علت و معلول کے نظریات کو توڑتی اور ہمارے کام اپنی مرضی کے مطابق بنایا بگاڑا کرتی ہے؟

لیکن اگر ایسا ہے تو یہ قطعی طور پر عقل میں نہیں آتا کہ میں نے اس جلیل المرتبت قدرت کی کون سی ایسی خطا کی ہے کہ وہ مجھ سے حرب کرنے پر تُل گئی ہے۔ یا ممکن ہے۔

دریا بوجود خویش موجے دارد
خس پندارد کہ ایں کشاکش با اوست

کا خیال درست ہو، مگر اس خیال میں بھی عقل و انصاف کی رُو سے بے پایاں نقائص نظر آتے ہیں۔

غرض کہ حیاتِ انسانی ایک سخت پیچ در پیچ جال ہے جس کے خانے اور تانا بانا سمجھ ہی میں نہیں آسکتا، آئے تو کیوں کر، ہمارے پانچ چھوٹے سے حواس، جو آئے دن فریب دیا کرتے ہیں، ہماری رہبری کے فرائض کیا خاک انجام دے سکتے ہیں۔ واقف ہوں یہ خوں نابہ فشانی کیوں ہے۔ یہ شیون و آہ و نوحہ خوانی کیوں ہے........ ہر سعی و عمل ہے زندگانی کے لیے۔ لیکن نہ کھلا کہ زندگانی کیوں ہے۔ میرے حالات کی نامساعدت، اور میری موجودہ زندگی کی ناقابلِ برداشت تلخیوں کا آپ کو علم نہیں ہے اور میں اس کی شرح کر کے آپ کے پُرسکون لمحوں کو مجروح کرنے کی سعی کیوں کروں ؟

صرف دبی زبان سے اس قدر عرض کروں گا کہ آپ میرے ماہ نامے "کاخِ بلند" کے واسطے ازراہِ معارف نوازی، بھوپال گورنمنٹ سے مستقل امداد مقرر کرا دیں۔

سر تیج بہادر سپرو، اور مسز نائیڈو نے مہاراجا پٹیالہ کو براہِ راست ایک معقول و مستقل امداد کے واسطے کافی گرم جوشی کے ساتھ خط لکھا ہے اور سر لیاقت حیات خاں، اور مسٹر پانیکار نے پختہ وعدہ کر لیا ہے کہ وہ مستقل امداد منظور کرا دیں گے۔

اس کے علاوہ سر تیج بہادر سپرو، مسز نائیڈو، سر اکبر حیدری اور سر محمد سلیمان دوسری ریاستوں میں بھی سعی کرنے کا وعدہ کر چکے ہیں۔ میں کوئی یک مُشت رقم نہیں چاہتا۔ میری غرض تو صرف اس قدر ہے کہ رسالہ میری محدود معاش پر اثر نہ کرے، یعنی میری پنشن اور برائے نام آبائی جائداد کی آمدنی اس میں صرف نہ ہو جائے۔

آپ کو قدرت نے بکمال فیاضی، قوت، اثر اور حسّاس و شریف دل کی دولت سے سرفراز فرماتے ہوئے ادبی ذوق بھی دیا ہے۔ کیا قدرت کی اس عدیم النظیر فیاضی کا یہ بہترین مصرف، اور اس کی عنایتوں کا شکریہ ادا کرنے کا یہ بہترین اسلوب نہ ہوگا کہ آپ مصائب میں دوسروں کی دستگیری فرمائیں ؟

دائم گل خوش بختی شاداب نمی ماند
دریاب ضعیفاں را در وقتِ توانائی

خدا کرے آپ اس دارالحوادث، اس ایک آن میں سو رنگ بدلنے والے دائرۂ شر میں، جسے دنیا کہتے ہیں، بہ خیر ہوں۔

نیازمند
جوشؔ

میرا مجموعہ جوشیات جلدوں میں مرتب ہوچکا ہے، اشاعت کے واسطے کروٹیں بدل رہا ہے، جس کا ایک حصہ، یہ میں ہی خوب جانتا ہوں کہ کس دشواری کے ساتھ زیرِ طبع ہے۔ باقی حصوں کا اللہ مالک ہے۔

برادرِ محترم! اگر بال بچوں کی مہیب ذمے داریاں میرے سر نہ ہوتیں تو میں خدا سے بھی دعا نہ مانگتا لیکن اب بھی میری خودداری اس خیال سے آسودہ ہے کہ میں نے ہندوستان کے کروڑوں افراد میں سے صرف پانچ اصحاب کو، جو میرے نقطۂ نظر سے انتہائی شریف ہیں، اپنی امداد کے لیے لکھا ہے، اور یہ وہ افراد ہیں جن سے امداد حاصل کرنے میں ضمیر شرمندہ نہیں ہوسکتا۔

پرچہ اواخرِ اکتوبر یا اوائلِ نومبر میں شائع ہوجائے گا۔ رسالے کے ابواب کی فہرست اور مطبوعہ اعلان کا تراشا منسلک ہے، جس سے جناب کو میرے اغراض و مقاصد کا بڑی حد تک اندازہ ہوجائے گا:

جاناں! بہ حاجتے کہ ترا ہست با خدا
آخر دمے بہ پرس کہ مارا چہ حاجت است

(۴)

دھول پور
۸ر اکتوبر ۱۹۳۵ء

اخی محترم

آمد سحر ندا ز میخانۂ ما
کاے رندِ خراباتی و دیوانۂ ما
برخیز، کہ پُر کنیم پیمانہ زمے
زاں پیش کہ پُر کنند پیمانۂ ما

جوشؔ

(۵)

مکتبہ جامعہ ملیہ قرول باغ، دہلی

۲۶ اکتوبر، ۱۹۳۵ء (رات کے چار بجے)

اخی محترم،

کچھ اوپر ایک عشرہ ہوا کہ خدمتِ عالی میں خط لکھ چکا ہوں جس میں آپ کو اطلاع کی گئی تھی کہ میں حسبِ قرار داد کیوں کر (کذا) ۲۷ اکتوبر کی رات کو دہلی اسٹیشن گیا تھا اور آپ کی خدمت میں نیاز حاصل نہ ہو سکا تھا۔

مجھے اپنے خط کے جواب کا بے چینی کے ساتھ انتظار ہے۔ کیوں کہ اب زمانے نے اپنی گرفت کو اور بھی سخت کرنا شروع کر دیا ہے۔

ہو رہے ہیں ظلم ہفت افلاک کے
امتحاں میں ایک مشتِ خاک کے

نیاز مند
جوشؔ

(۶)

۱۷ اکتوبر ۱۹۳۵ء

اخی محترم

بھوپال سے جو اطلاع آئی ہے، ہر چند یاس انگیز ہے، پھر بھی اس لحاظ سے کہ آپ نے از راہِ اخوت سعی تو فرمائی۔ میں آپ کا دل سے شکر گزار ہوں۔

"کلیم" کا ایک نسخہ خدمتِ عالی میں حاضر کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں، اگر پسند آئے تو براہ کرم اپنے وسیع حلقۂ احباب میں اس کی توسیع کی کوشش کیجیے۔ اور خود بھی دیگر احباب کی طرح کم سے کم بیس پرچوں کی خریداری منظور فرما کر کلیم کی امداد کیجیے۔ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ میں کتب خانوں وغیرہ کو مفت پرچے روانہ کر سکوں گا۔

خدا کرے آپ بہمہ وجوہ خیریت سے ہوں۔ میری بچی کی طبیعت زیادہ خراب ہے۔ دعا کیجیے، لیکن کس سے، کیا درد مند انسان کی فریاد سننے والا کوئی موجود بھی ہے؟

آپ کا بندۂ کرم
جوشؔ

خورشید علی خاں

شالی مار

اسلام آباد

۳؍ جولائی ۷۲ء

آپ نے تو کمال کر دیا خورشید صاحب، بے مہری اور وہ بھی اس قدر بھرپور، یہاں سے گئے تو پھر کروٹ ہی نہیں لی، ایک دُبلا پتلا خط بھی نہیں بھیجا۔ میرے تصوّر میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ آپ اس قدر بے مروت انسان ہیں۔

جفائیں دیکھ لیاں، بے وفائیاں دیکھیں
بھلا ہوا کہ تیری سب برائیاں دیکھیں

خورشید کی ظلمت فشانیوں کا صیدِ زبوں

خورشید علی خاں۔ فراموش کنندۂ دوستاں　　　　جوشؔ

---

(۲)

شالی مار ⑧

اسلام آباد

۲۳ ستمبر ۱۹۷۲ء سہ پہر

تابندہ باد حضرتِ خورشید — کئی بار، آپ کو خط لکھنے کی ترنگ پیدا ہوئی، اور ہر بار یہ سوچ کر رُک گیا کہ قدرت اللہ شہاب، آپ کے باب میں، کوئی آخری بار کہہ یا طے کر دیں، تو خط لکھوں۔

اس کم بخت اسمبلی نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے، شہاب صاحب کو لاکھوں بار فون کر چکا ہوں کہ اُن سے مِل کر، آپ کے مسئلے کو، حسبِ مراد طے کرا دوں، لیکن ہر بار جواب آیا کہ وہ اسمبلی گئے ہوئے ہیں ——— بہر حال سعی میں لگا ہوا ہوں، "خدا" میری سعی کو مشکور فرمائے۔

یقین فرمائیے آپ یاد اور بہت یاد آتے ہیں، جی چاہتا ہے یا تو خود کراچی پہنچ جاؤں، یا آپ کو یہاں بلا لوں۔ مگر اس عالم کون و فساد میں، جی چاہنے سے ہوتا کیا ہے اور آسمان سے آواز آتی ہے "تھام لے گردھاری لال کا "ل"۔

اپنے بھائی سے، جو بہت ہی اچھے آدمی ہیں، میرا اسلام کہیے۔ اب اُن کی صحت کا کیا عالم ہے۔

اور ذرا پتا چلائیے سلامت علی خاں کا۔ اُن کے سر پر جو مصیبت آئی تھی، ٹلی کہ نہیں ان کا پتا بھی لکھیے، اور ان کی بیگم اور اُن کے بچوں سے میری دعا کہیے۔

رخسانہ بی بی کے پاس ہونے کی مبارک باد کا، دلی شکریہ قبول کیجیے ـــ آپ کو یہ سن کر افسوس ہوگا کہ اُس کی صحت روز بروز گر رہی ہے اور، الھڑپن کی بنا پر ڈاکٹر جو دوا دیتا ہے اُس کے استعمال سے بے پروائی بھی برتتی ہے ـــ ایک عشرے کے بعد لاہور جا کر اُس کو سمجھاؤں گا کہ اپنی جان سے اس قدر غفلت نہ برتے۔

کل، فلیش مین ہوٹل کی طرف سے گزرتے ہوئے، آپ کی معشوقہ کو دیکھا، بڑی آن تک کے ساتھ، ٹھمک ٹھمک کر قدم اٹھاتی چلی آ رہی تھی، بے ساختہ جی چاہا کر اس کو، جھٹ سے اٹھا کر، اپنی موٹر میں ڈال لوں، اور، عمر عیار کے مانند اس کو زنبیل میں ڈال کر، اور، اس کی زبان میں "سوزن" لگا کر، آپ کے نام پارسل کر دوں۔ اور جب وہ چھم سے آپ کے خلوت کدے میں قدم رکھے، اسی آن، آپ کی بیگم دھم سے کود پڑیں چھت سے، اور عاشق و معشوق دونوں کی لپشت پر، دھما دھم مُکّے پڑنے لگیں اور پھر، آپ کی چیخ، اور اُس کا پیشاب نکل جائے۔

آپ کی بہن اختر نے بھولے بھی یاد نہیں کیا۔ لیکن اُن تک میری شکایت نہ پہنچائیے گا۔

آپ کا چاہنے والا،

جوش۔

اسلام آباد میں، الحادستان کا سفیر۔

جب بھی، کانٹوں نے، پاؤں بَرمائے
تیری نگری کے پُھول، یاد آئے

جی ہاں، یہ بڑا خطرناک سانحہ ہے کہ :

دل کا طوفاں ۔ دماغ تک پہنچا
گھُپ اندھیرا ۔ چراغ تک پہنچا

دلِ حکمت میں، چُبھ گیا بھالا ۔ کیا کرے ۔ اب تو پھنس گیا سالا

---

(۲)

اسلام آباد

۲۲، نومبر ۱۹۷۲ء

ہائے خورشید علی خاں، ہم دونوں پر آسمان ٹوٹ پڑا ہے، ہم دونوں کے چھوٹے بھائی، وہاں چلے گئے ہیں، جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا ۔

بنال بلبل ، اگر بامنت، سرِ یاریست
کہ ما، دو عاشقِ زاریم وکارِ ما زاریست

اس وقت میرے دل کا یہ عالم ہے کہ آپ کو، ہاتھ سنبھال سنبھال کر خط لکھ رہا ہوں، لیکن قلم ہے کہ قابو میں نہیں ہے، حروف کی شکلیں بگڑی چلی جا رہی ہیں ۔

اس وقت رات کے دو بجے ہیں، سناٹا ہر طرف چھایا ہوا ہے اور دل اس قدر زور زور سے دھڑک رہا ہے کہ اُس کی کھٹ کھٹ کانوں میں گونج رہی ہے ۔

ہم دونوں کے بھائی، ہم سے منہ موڑ کر چلے گئے اور سب سے بڑا سانحہ یہ ہے کہ ہم جی رہے ہیں ۔ میں اپنی زندگی سے پشیمان ہوں، خورشید علی خاں ۔ آخر میں کب تک نہیں مروں گا ۔ اس ہول ناک کرّے میں موت سے زیادہ کوئی چیز یقینی و لازمی نہیں ہے ۔ یہ دنیا

نہیں، بوچڑ خانہ ہے۔

آخر ہم یہاں ایک، سب سے الگ تھلگ، اور سب سے بے پرواہ مسافر کی طرح کیوں نہیں رہتے، آخر یہ کیا پاگل پن ہے کہ ہم یہاں اقربا و احباب سے محبت کرتے ہیں۔ اور :۔

بدل اگر نہ خلد، ہرچہ از نظر گزرد
خوشا روانیٔ عمرے کہ در سفر گزرد

پر عمل کیوں نہیں کرتے ـــ لیکن، ہم نامرادوں کے سینے میں ایک ایسا دل ہے جو محبت کیے بغیر دھڑک ہی نہیں سکتا۔ ہم کسی سے بھی دل نہیں لگاتے، دل لگانا نہیں چاہتے، مگر یہ سرکش و نامراد دل، ہمارے علی الرغم، دوسروں سے محبت کرنے لگتا ہے۔ حیف صد حیف، ہماری ساخت پر۔

بہر حال، ہم دونوں اس وقت لہولہان ہیں، اگر ہم ایک دوسرے کے قریب ہوتے، تو شاید کچھ بٹ جاتا ہمارا غم ـــ آپ پھر بھی، اپنی بیوی بچوں کے ساتھ ہیں، جن کی معیت سے کچھ نہ کچھ غم بٹ ہی جاتا ہوگا۔ میں نامراد یہاں بالکل تنہا ہوں، بیوی، بیٹی اور بیٹا، کوئی بھی میرے پاس نہیں۔ دن بھر تو لکھنے پڑھنے میں وقت گزر جاتا ہے لیکن غروب کے وقت دل ڈوبنے لگتا ہے۔ ہائے، میں کیا کروں، کدھر جاؤں۔

آپ ہی کی طرح، آپ کا، لہولہان دوست:
جوشؔ

یہ منسلک خط، ذہین شاہ کے حوالے کر دیجیے، اُن کا پتا یاد نہیں۔

---

(۴)

مکتوب کافر
از
اسلام آباد
ا ر فروری ۱۹۷۳ء سرِ شام

حضرتِ خورشید، سورج ڈوبنے والا ہے، اور میں، کانپتے ہاتھوں سے، آپ کو خط لکھ رہا ہوں۔

یعنی :۔ شمع کشتند و زِ خورشید نشانم دادند

بیماری سے اس قدر نڈھال ہوں کہ ہات جما جما کر، لکھ رہا ہوں، پھر بھی، حروف کی شکلیں بگڑتی چلی جارہی ہیں۔ اب لکھا نہیں جاتا۔ اگر، خدانخواستہ زندہ رہا، تو کل لکھوں گا۔

لیجیے، تاریخ بدل گئی، آج دوسری فروری ہے، اور حضرت اکبر الٰہ آبادی کے بقول:

افسوس ہے کہ زندہ ہوں کہنا پڑا ہے حال
کیا مختصر جواب یہ ہوتا کہ مر گیا

کے مطابق آپ سے اپنا حال بیان کر رہا ہوں۔ آج، خلافِ معمول، دیر اور بہت ہی دیر سے بیدار ہوا۔ رات کو سوا سات بجے، تکیے پر سر رکھ دیا تھا بہت دیر میں نیند آئی، دماغ، سوتے میں تمام رات باتیں کرتا، اور میرے آخری مجموعۂ کلام "محمل و جرس" کا دیباچہ لکھتا رہا۔ نیند کا رشتہ بار بار ٹوٹتا اور جڑتا رہا ـــ اب خدا خدا کر کے سات بجے بیدار ہوا۔ اور کراہ کراہ کر خط لکھ رہا ہوں۔ بات یہ ہے کہ میرا دل اب، آہستہ آہستہ دم توڑ رہا ہے۔ بھوک بند ہو چکی ہے، سانس کھینچ کھینچ کر لیتا ہوں، ناتوانی اس قدر بڑھ چکی ہے کہ کھڑا ہوتا ہوں تو پنڈلیاں کانپنے لگتی ہیں۔ جی اس قدر اُداس ہے کہ خوش مزاجی مفقود ہو چکی ہے۔ فانی کی طرح چُپ چُپ اور مغموم رہنے لگا ہوں۔ خون اور پیشاب کا امتحان اور ایکس رے سے کسی خاص مَرض کا پتا نہیں چلتا، ڈاکٹر کہتا ہے آپ کے اعضائے رئیسہ نارمل ہیں۔ لیکن اُسے کیا معلوم کہ میں آہستگی کے ساتھ، ختم ہوتا اور بجھتا چلا جارہا ہوں، چوں قضا آید، طبیب ابلہ شود اس بجھاوٹ کے باوجود، ارادہ کر رہا ہوں کہ "عشرے" میں کراچی آکر، آپ سب سے مل لوں، اور آخری بار سب کو گلے لگالوں۔ بہت دن سے دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ ۱۹۷۲ء میرا آخری سال ہوگا، سو، بحمداللہ کہ اس کے آثار اب ظاہر ہو چکے ہیں۔ ہائے میری فتنۂ آخر الزماں بھی، تقریباً ایک سال سے بیمار ہے اور اس کی بیماری کا تسلسل گھُن کی طرح میری زندگی کو چاٹے جارہا ہے۔ ہم تبرک ہیں، بس اب کرلے زیارت مجنوں۔

آپ کا چاہنے والا
جوشؔ مرحوم

(۵)

۱ر اگست ۱۹۷۳ء

میاں، کچھ تو منہ سے بولیے، سر سے کھیلیے ۔ گپ چُپ کے لڈو کھائے
کب تک بیٹھے رہیے گا۔ ایسی تیسی میں جائے یہ خاموشی۔

جوشؔ

---

(٦)

اسلام آباد

۱۷ر اگست ۱۹۷۳ء

صبح کو چار بج کر چودہ منٹ پہ یہ خط شروع کر رہا ہوں۔ دور دور تک اندھیرا اور سناٹا چھایا ہوا ہے۔ آپ کے طلوع ہونے میں ابھی بہت دیر ہے۔ کمرے میں روشنی ہوتے ہی میدان کے تمام پروانے اور کیڑے مکوڑے ٹوٹ پڑے ہیں مجھ پر۔ تمام میز بھری ہوئی ہے حشرات الارض سے ـــ اللہ اللہ، کتنے جانوروں کے لشکر پوشیدہ ہیں گھاس پھونس میں۔ ۱۹۲۴ء میں ایک غزل کہی تھی اس کا ایک شعر بے ساختہ یاد آرہا ہے۔

یہ، کس کی حیات افروز نظر نے ۔ چھیڑ دیا ہے عالم کو
ہر خاک کے ادنیٰ ذرّے میں ہنگامہ ہے لاکھوں جانوں کا

ان تمام حشرات میں بالکل وہی نظامِ حیات کارفرما ہے جو میری زندگی پر حاوی ہے، اور ان سب کے وظائفِ اعضا بھی میرے ہی سے ہیں۔ فرق صرف شعور کا ہے۔ یہی شعور ایک دولتِ بیدار ہے اور ایک زبردست آزار بھی۔

کل، سارا دن "اُس" کے ساتھ گزرا۔ اُس کی بڑی بہن نے کہا بھی کہ اب جوش صاحب کو آرام کرنے دو، اپنے کمرے میں چلی جاؤ، لیکن وہ فتنۂ روزگار میرے پہلو سے نہیں اٹھی، اور عشوہ و ناز کے خنجر مارتی رہی۔

روزگار نے مجھ پر اس خبیث عمر میں دو کٹیلی چھوکریوں کو مسلط کر دیا ہے۔ ہر چند میرے چہرے پر ماہ و سال کی شکنیں دوڑ چکی ہیں، اور میرے خط و خال کی کمر ٹوٹ چکی ہے لیکن، روحِ کائنات نے، خدا جانے ان لونڈیوں پر کیا جادو کر دیا ہے کہ وہ میری دل داری پر کمر باندھے

رہتی ہیں، وہ میرے چہرے کے بھیانک پن کو دیکھتی ہی نہیں، وہ کہتی ہیں، ہم کو حسین چہرے کی نہیں حسین ذہن کی ضرورت ہے۔ ارے کروڑوں کم سِنوں میں، ایک آدھ چھوکری اس مزاج کی بھی نکل آتی ہے جو شاعر کے غروب کی تیرگی کو، طلوع کی جگمگاہٹ میں تبدیل کر دیتی ہیں۔

ان الھڑوں سے متاثر ہو کر، ایک نظم کہی ہے، آپ بھی سُن لیں :

ترانۂ شکر

دیارِ خال و خد کے، حکمراں ہیں
کہ ہم، محبوبِ قومِ گل رُخاں ہیں
کڑی کرنوں کا منھ اُترا ہوا ہے
گھنی زُلفوں کے ہم پر سائباں ہیں
نہ کیوں نازاں ہوں اپنی ذات پر ہم
کہ ملجائے نیاز دل براں ہیں
زہے قسمت ہماری آرزو میں
کسی کی آنکھ سے، آنسو رواں ہیں
بڑی حسرت سے، حوریں تک رہی ہیں
خدایا۔ ہم، یہ کس کے میزباں ہیں
ابھی تک ہیں۔ حکایت در حکایت
ابھی تک۔ داستاں، در داستاں ہیں
برہمن ہیں۔ مگر ایسے برہمن!
کہ شاہنشاہِ اقلیمِ بُتاں ہیں
بحمد اللہ، کہ ہم۔ اس عمر میں بھی!
تمنائے دلِ دوشیزگاں ہیں
حسینوں کی رفاقت سے ہم اے جوشؔ
زہے قسمت کہ اب تک نوجواں ہیں

ملاحظہ فرمائی آپ نے ایک بڈھے کھوسٹ کی یہ نظم؟ حوریاں، رقص کناں، ساغر و پیمانہ زدند!
آپ نے حضرت حافظ کا یہ شعر تو بارہا سنا ہوگا:

گرچہ پیرم، تو، شبے، تنگ در آغوشم گیر
کہ سحرگہ۔ زکنارِ تو۔ جواں برخیزم

شاید یہ جواب برخیزم" کا کھیل اس غرض سے کھیلا جا رہا ہے کہ میری شدّت عقل کا لوہا پگھل کر، رقّت قلب کے سانچے میں ڈھل جائے اور میں عشقیہ شاعری کی مانگ کو صندل سے بھر دوں۔

کوثر صاحب نیازی تو مجھ کو کراچی لے جانا چاہتے ہیں لیکن وہ تسنیم ذی نفس کہہ رہی ہے کہ میرا ابھی رزرویشن ہو جائے تو ساتھ چلنا۔ اب دیکھیے اُس کا رزرویشن کب ہوتا ہے۔ آج کوثر صاحب شام کو میرے گھر آ رہے ہیں، ان سے کہوں گا کہ اُس کے سفر کا بھی بندوبست کر دیں، ورنہ میری جوتی جائے گی کراچی۔

آپ کا چاہنے والا
جوشؔ۔ لب نوش

(۷)

۳؍ نومبر ۱۹۷۳ء

درخشاں باد حضرتِ خورشید۔ آپ کا نفسیات میں الجھا اور بجھا ہوا خط ملا، پڑھ کر جی گھبرانے لگا۔

ایک بجے رات سے جاگ رہا ہوں، مجھ کو 'از روے حساب' اٹھنا چاہیے تھا ڈھائی بجے صبح کو، ڈیڑھ گھنٹے پیش تر بیدار ہو گیا۔ کچی نیند میں بیدار ہو جانے کے باعث دماغ سالا اونگھا ہوا ہے اور ایسا معلوم ہو رہا ہے، گویا کسی بوڑھی عورت کے آغوش میں بھنچا ہوا، اوبھی اوبھی سانسیں لے رہا ہوں۔

کچھ نہ پوچھیے کہ یہ گزشتہ 'پہاڑ سے چھ مہینے' کیسے گزارے۔ ان پورے چھ مہینوں میں بالکل تنخواہ نہیں ملی اور وہ بُحرانی عالم رہا کہ اللہ دے اور بندہ لے۔ میری جگہ، دوسرا ہوتا تو لوگوں کو ڈھیلے مارنے لگتا۔

بارے خدا خدا کر کے اب بھٹو صاحب نے تعلیمات کی وزارت میں تقرر کر دیا ہے اور

پچھلی تنخواہ بھی مل گئی ہے۔

یہاں ایک "اکاڈمی آف لیٹرز" قائم کی جانے والی ہے، میں نے قدرت اللہ صاحب شہاب سے کہا ہے کہ وہ اس سلسلے میں آپ سے کام لیں، انھوں نے مجھے مشورہ دیا ہے کہ میں آپ سے اس کی اسکیم لکھوا کر، انھیں دکھاؤں تاکہ کام آگے بڑھ سکے۔

اب آپ اس اکاڈمی کے تمام مقاصد اور ضوابط لکھ کر، مجھے جلد بھیج دیں۔ اس وقت دماغ سویا ہوا ہے۔ قلم چل نہیں رہا ہے، ذہن پر ایک ڈھکن سا رکھا ہوا ہے۔

آپ نے شہاب صاحب کو جو اسکیم دی تھی، اس لائن پر دوسری اسکیم مرتب کر دیجیے۔ ابھی کراچی آنے کا قصد نہیں ہے۔ صالحہ کا فون آیا تھا بلانے کا، لیکن کیسے جاؤں۔

چھ مہینے سے لاہور بھی نہیں گیا ہوں اس سے آپ میری مجبوری کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ایسے بڑی گھٹن ہے طبیعت میں، کانوں میں دل کے دھڑکنے کی آواز آرہی ہے، سناٹا سائیں سائیں کر رہا ہے۔

نیاز مند

جوش

اسلام آباد - ۳ - ۱۱ - ۷۳

چار بجنے میں گیارہ منٹ باقی ہیں

والسلام مع.....

(۸)

۱۲ نومبر ۱۹۷۳ء

افقِ اخلاص کے تاباں خورشید۔ پائندہ و تابندہ و رخشندہ باد

آپ اکاڈمی کا مقصد دریافت کرنا چاہتے ہیں، سو بندہ پرور اس کا مقصد انقباضِ جہل و انشراحِ علم کے سوا، اور کیا ہو سکتا ہے۔

اس مقصد کے حصول کی خاطر، فلموں، ڈراموں، رسالوں، کتب خانوں، درس گاہوں، مقالوں، جلسوں، تصنیفوں، تالیفوں اور ترجموں سے کام لیا جا سکتا ہے۔

چالاک صوفیوں اور مجذوب شاعروں نے قوالوں کی "آہے وا" اور مشاعروں کی "سبحان اللہ"

کی وساطت سے، عشق وجنون کو ابھار" اور عقل وشعور کو بھینچ کر بالعموم ایشیا اور بالخصوص ہندوستان و پاکستان کو، جذبات کی افیون پلا پلا کر انٹا غفیل کر رکھا ہے۔ اسی غوطہ سے لوگوں کو جگانا اور حکمت و منطق کی راہ پر چلانا، ہمارا، سب سے بڑا فریضہ ہے۔ اقوال واساطیر نے ہماری عقل کا گلا گھونٹ رکھا ہے اور ہمارے دماغ کو ایک ایسے ڈھرتے پر ڈال دیا ہے کہ ہم بے بنیاد ایقان کو اوڑھنا بچھونا بنا چکے، اور عقائد کا دودھ پی پی کر تجسس و تحقیق کو ایک شیطانی عمل سمجھنے لگے ہیں، ان خرافات کے جادو گھر سے، انسان کا نکالنا سب سے بڑا شرف ومجد ہے۔ آپ انھیں باتوں پر نگاہ کر کے اکاڈمی آف لیٹرز کا ڈھانچا تیار کریں۔ اور ایک ہفتے کے اندر بھیج دیں۔ تاکہ میں آپ کو یہاں بلالوں۔

جی ہاں اب وہ اگلی سی مُعلقیت باقی نہیں رہی ہے، بال و پر نکل آئے ہیں۔ لاہور جانے کی طاقت آگئی ہے۔ امّ الشعرا، کی آمد کا انتظار ہے۔ وہ آلیں، تو لاہور جا کر کوئے جاناں کا طواف کر آؤں۔ اس سفر میں آپ میرے تصوری ساتھی ہوں گے اور جب چلنے لگوں گا تو پہلے ہوٹل "فلیش مین" جا کر آپ کی معشوقہ، طنّاز کو بھی آنکھوں میں رکھ کر لاہور لے جاؤں گا۔ تاکہ اثنائے سفر میں، آپ کا دل بشاش رہے۔

کل رات کو، ایک شعر وسخن اور ناؤ نوش کی محفل میں شریک ہوا تھا۔ سامعین خام تھے، داد تو سب نے بہت چیخ چیخ کر دی۔ مگر ان کی آنکھوں میں چوں کہ سخن سنجی کی دمک نہیں پائی۔ اس لیے اہل بمبئی کے بقول "مجا نہیں آئی"۔ رات کو دیر سے گھر پہنچا، نئے لحاف میں لیٹا، روئی کی گرمی نے جسم کو تو آرام پہنچایا، لیکن خالی روئی سے کیا ہوتا ہے، جب تک کہ "دوئی" نہ ہو۔ بستر کو ٹٹولا، کسی چہکا دینے والے پنڈے کو پہلو، میں نہیں پایا۔ کروٹوں پر کروٹیں لیں، لیکن نشے کے باوصف دیر تک نیند نہیں آئی۔

میں شاید مرتے دم تک بوڑھا نہیں ہوں گا۔ میر انیس نے فرمایا ہے کہ: "جو، جا کے نہ آئے، وہ جوانی دیکھی" لیکن یہاں معاملہ برعکس ہے، یہاں تو یہ عالم ہے: جو، آ کے نہ جائے، وہ جوانی دیکھی"۔

اچھا، اب ٹہلنے کا وقت آگیا۔ آسمان کی سیاہی پر ہلکی سی گلابی سفیدی آچکی ہے۔

آپ کو خوابوں میں دیکھ کر غسل کرنے والا

جوشؔ

(۲۰۸) ایف۔ شالی مار ۱ - ۸

اسلام آباد

ہر چند نیا قلم خریدا ہے، لیکن سالا چل نہیں رہا ہے، بار بار انگلیوں سے ایڑ دے رہا ہوں حرام زادے کو۔

(۹)

۲۷ نومبر ۱۹۷ء

آخر چلے گئے "تنہا" میرا دل توڑ کر ــــ اور جایئے، دیکھ لیا نتیجہ اس بے وفائی کا؟ اور جاؤ "پھوپی اور جھانکو"۔

قلم بے حد خراب ہے، روشنائی اُگل دینے کے بعد بھی حرام زادہ لکھ نہیں رہا ہے۔ جلئے سالا... ہم بھی اب اس سے کام نہیں لیں گے، دوسرا قلم خرید کر، آپ کو خط لکھیں گے۔

اپنی صحت سے مطلع کیجیے۔ میرا سارا دل آپ میں لگا ہوا ہے۔

آپ کے فراق کا ڈسا ہوا

جوشؔ

(۱۵۳) ایف ۳-۶۔ اسٹریٹ (۶۰)

اسلام آباد

(رات کے ایک بجے)

سوئے سنسار، جاگے پاک پروردگار

(۱۰)

۱۲ جنوری ۱۹۷۴ء

لیجیے خورشید علی خاں، میں یہاں سے پانچویں فروری کو تیزگام سے کراچی روانہ ہو رہا ہوں۔ چھٹی فروری کو، کینٹ اسٹیشن پر موٹر لے کر آجایئے گا۔

میں اپنے یہاں نہیں، آپ کے گھر قیام کروں گا، کھانا آپ کے ذمہ ہوگا اور پینے کا بار میں خود اٹھاؤں گا۔

اپنے یہاں اس لیے نہیں ٹھہروں گا کہ وہاں نہ سواری ہے اور نہ ٹے لی فون۔
بڑی مخلصانہ بے تکلفی کے ساتھ مطلع فرمایئے کہ میرے قیام سے آپ، یا آپ کی بیگم کو کوئی الجھن تو نہیں ہوگی۔

آپ کا مخلص
جوشؔ

اسلام آباد

(۱۱)

۲۳، اپریل ۱۹۷۴ء

نور افشانِ جہان و جہانیاں، خورشید علی خاں، لیجیے، پھر نزولِ اجلال ہو رہا ہے میرا، کراچی میں۔ اٹھائیسویں تاریخ کو، تیز گام سے، چلوں اور انتیسویں کو شہر کراچی پہنچوں گا۔
کیل کانٹے سے درست ہو کر اسٹیشن آجایئے گا ـــــ سلامت علی خاں اور میاں راغبؔ کو بھی اطلاع دے دیجیے گا، اور شعرائے امرد کو بھی۔

نیاز کوش
مرحوم جوشؔ

متصل LIBYON ایمبیسی
(۶۰) اسٹریٹ۔ اسلام آباد

(ضروری)

خورشید علی خاں کا پتا یاد نہیں رہا، یہ خط آج ہی اُن تک پہنچا دیجیے۔

(۱۲)

۷، جولائی ۱۹۷۴ء

ارے آپ بھی، منوّر عباسؔ یوسوس فی صدور الناس" کے مانند، وہ نکلے، جس کو "مسٹر آنکھ اوٹ، پہاڑ اوٹ" کہا جاتا ہے ـــــ میرے کراچی سے آنے کے بعد آپ نے ایک سطر بھی نہیں

لکھی مجھ کو۔ مبارک ہو یہ سرد مہری، یہ طوطا چشمی۔ یہ ابو سفیانیت۔

جس نے بھی معاویہ کا نمک کھایا ہے، دوستوں پر ہمیشہ ظلم ڈھایا ہے۔

اب جی میں یہ ٹھانی ہے کہ اب کی آیا، تو آپ کو خبر ہی نہیں کروں گا اور بے ملے واپس آجاؤں گا۔ نام خورشید، اور دل میں یہ ظلمتِ شدید، المدد یا حضرتِ یزید۔

جوشؔ :۔

یعنی :۔ اے وائے بر اسیرے کز یاد رفتہ باشد۔

نصف النہار۔

اپنا پتا کیوں لکھوں، جواب کی تشنگی نہیں۔ بھاری پتھر تھا۔ فقط چوم ہی کر چھوڑ دیا۔

(۱۳)

ا ر اگست ۱۹۷۶ء

میری جان، خط ملا، غصہ فرو ہو گیا، اور آنے لگا پیار آپ پر۔ آپ کا جلد جلد خط نہ آئے، تو بلبلا اٹھتا ہوں، اور اسی بلبلاہٹ میں آپ پر برس پڑا۔

میں اسی مہینے کی سترھویں، یا چھبیسویں کو کراچی آرہا ہوں، جب آؤں گا، لجلجا کر آپ کو کلیجے سے لگاؤں گا اور فوراً اچھڑ جاؤں گا۔

شفیع الحق[۱۳] کے نام کا خط منسلک ہے۔ مل لیجیے۔ آپ میرے کام کے واسطے اپنا کام چھوڑ کر دوڑتے ہیں آپ کی اس ادا پر غور کرتا ہوں تو بڑے زناٹے کے ساتھ استادگی ہونے لگتی ہے۔

آپ کو خوابوں میں دیکھ دیکھ کر، بار بار غسل کرنے والا

جوشؔ

(۱۵۲) ایف ۳-۶ ۔ اسٹریٹ (۶۰) اسلام آباد

پرسوں، لاہور جا رہا ہوں ایک ہفتے کے لیے "دل پھر طواف کوئے ملامت کو جائے ہے"۔

(۱۴)

۷ ر ستمبر ۱۹۸۶ء

آپ نے پھر چپ سادھ لی، سورج گرہن پھر پڑ گیا، ہوا پھر بند ہو گئی، پھر، شدید حبس ہو گیا۔ آخر یہ کنجوسی کس کام کی۔

پرسوں سلامت علی خاں آئے تھے ایک بُڈھے کو بھی ساتھ لائے تھے، ان کو دیکھ کر، آپ کی یاد ستانے اور کراچی کی ہوا آنے لگی۔

لیجیے یہ خط ہے علامہ کے نام، اُن کا پتا اور پورا نام ذہن میں نہیں۔ آپ جائیں اور اُن کو یہ خط دے دیں ــ مناسب ہو تو ان کے بیٹے سے بھی بات کرلیں، کام اشد ضروری ہے۔ اس لیے جلد اور قوی ترین الفاظ میں اُن سے ملیے۔

میں شیرینی و تلخی کے مابین جی رہا ہوں، مسکراتا بھی ہوں اور بسورتا بھی۔

آپ کا شیدائی

جوشؔ غوغائی

(۳۵۱) الیف ۴/ ۶ اسٹریٹ (۶۰) اسلام آباد

۸ بجنے میں پانچ منٹ۔

لے ....!

(۱۵)

۱ر اکتوبر ۱۹۷۴ء

بڑا غضب کیا خورشید علی خاں آپ نے، اچانک اپنی رخصت کی خبر دے کر، مرجھا کر رکھ دی آپ نے پھول سی شگفتہ صبح۔ ابھی چار بجے بیدار ہوا، میز پر آپ کا خط رکھا ہوا تھا، لفافہ چاک کر کے پڑھا، دل چاک چاک ہو گیا۔

طے تو یہ ہوا تھا کہ ہم دونوں ساتھ چلیں گے یورپ، لیکن آپ نے تنہا جانے پر کمر باندھ لی۔

سروِ سیمینا، بصحرا می روی

سخت بے مہری کہ بے ما می روی

آپ کے بچھڑ جانے کا اس قدر دھڑکا ہے کہ خط لکھ رہا ہوں اور حروف کی شکلیں مسخ ہوتی چلی جارہی ہیں۔

ایسے ایکا ایکی یہ اشتعلا کیا کھڑا ہو گیا کہ آپ اس قدر جلد جا رہے ہیں۔ کچھ روز تو اور توقف کیا ہوتا۔ ممکن ہے ہمارا ساتھ ہو جاتا۔

اگر آپ اس قدر جلد یورپ چلے گئے، تو لکھ رکھیے میری یہ پیش گوئی کہ جب واپس آئیں گے،

دکان کو نہیں پائیں گے، اس کی اینٹ سے اینٹ بج چکی ہو گی اور کوئی وجہ معاش باقی نہ رہی ہو گی۔
جا بیٹا، جایئے، میرا دل توڑ کر جایئے۔ آپ جب یورپ سے پلٹ کر آئیں گے، مجھے نہیں پائیں گے۔ یہ میرا آخری خط ہے۔

آپ کی رخصت سے بوکھلایا ہوا۔
جوش۔

اسلام آباد۔
صبح ۴ ۱/۲ بجے۔ آغاز سحر۔
سلام۔ آخری سلام!

(۱۶)

۲۳ دسمبر ۱۹۷۴ء
لاہور (پھر اس کے بعد)
اسلام آباد

خورشید صبح کوہساراں آج کل فردوسِ لاہور میں شرفِ قیام حاصل ہے۔ یعنی ہر صبح صبح بنارس، اور ہر شام، شام اودھ کو شرما رہی ہے۔

ابھی ابھی "وہاں" سے، اپنی سکونت گاہ یعنی سید شوکت حسین صاحب کے مکان پر آیا ہوں۔ آفتاب کے غروب اور میرے طلوع میں صرف پندرہ منٹ باقی ہیں۔ تنہائی کا عالم ہے اور آپ کی یاد ستا رہی ہے۔ کاش، اس وقت آپ بھی ہوتے۔ ہائے، ایسے میں، اُن کو ڈھونڈ کے لائیں کہاں سے ہم۔

آپ میرا دل دکھا کر تنہا لندن چلے گئے۔ میری ہائے آپ پر ایسی پڑی کہ دل کا دورہ پڑ گیا آپ نے "بترس از آہِ مظلوماں" سنا ہو گا۔ اب آنکھ سے دیکھ لیا۔

آپ لندن کس غرض سے گئے ہیں اور کب تک پلٹ کر آئیں گے۔ میں تو ایک ایک پل گن رہا ہوں۔

"یوسفِ گم گشتہ، باز آید، بکنعاں، غم مخور"

سردی بہت شدید ہے۔ عید کے دوسرے دن یہاں سے چلا جاؤں گا۔ اور پھر وہی تنہائی ہو گی اور میں۔

میں ہی نہیں، اور بھی 'کوئی' آپ کو یاد کرتا رہتا ہے۔ کس قدر کشش ہے آپ کی ذات میں۔
کراچی میں ٹیلی ویژن کا مشاعرہ تھا، میں نہیں گیا۔ آپ کے بغیر کراچی میں کچھ بھی باقی نہیں رہا ہے۔ اس لیے وہاں جانے سے کتراتا ہوں۔ آپ کو وہاں نہیں پاؤں گا، دل تھام کر رہ جاؤں گا۔
اب تو آپ اچھے ہو چکے اور خوب مزے اڑا رہے ہوں گے۔ وہاں کے جملہ مشاغل نوٹ کرتے جایئے، اور مجھ کو، یہاں آکر سنایئے۔ کاش میں بھی آپ کے دوش بدوش لندن کی گلیوں میں پھرتا اور حسینوں کے غولوں میں گھرتا۔
لیجیے شام ہو گئی، بوتل سامنے رکھ دی گئی اور گلاس چیخنے لگا کہ بابا ہم کو جلدی سے اٹھاؤ اور منھ سے لگاؤ۔ اچھا، اے میرے دور افتادہ حبیب اب تحریر ختم کر رہا ہوں۔ لیکن پتا تو آپ کا ہمراہ نہیں ہے، پنڈی جا کر یہ خط روانہ کروں گا۔

آپ کا شیدائی
جوش ملیح آبادی

پنڈی پہنچ کر لکھ رہا ہوں۔ آج ۴ جنوری ۱۹۷۵ء ہے۔ دیر سے بیدار ہوا ہوں، ۶ بجنے میں گیارہ منٹ باقی ہیں جھینپا جھینپا بیٹھا ہوں۔ پھٹکار برس رہی ہے مجھ دیر بیدار پر ——
جلدی لکھیے کب آیئے گا۔ گھڑیاں گن رہا ہوں آپ کی واپسی کی۔
لاہور شریف میں کچھ رباعیاں، دو تین نظمیں کہی ہیں اور ایک مطلع۔ پہلے مطلع سن لیجیے۔

گاہ دل، اتنی لطافت میں ڈبوتا ہے مجھے
چاندنی کا وزن بھی محسوس ہوتا ہے مجھے

اب رُباعی :۔

اپنے کو، جو وہ رہینِ تمنّا کر لے
خود پر، جنّ و ملک کو، شیدا کر لے
میرے دل کے صنم کدے میں اے جوشؔ
وہ بُت ہے جو خُدا کو بھی اغوا کر لے

دستِ افکار کا سبو ٹوٹ گیا
پیمانۂ ذوقِ جستجو ٹوٹ گیا
جب عشق کے فرمان سے آنسو ٹپکے
تو، عقل کی آنکھوں کا وضو ٹوٹ گیا

○

یہ عمر تری اور یہ محبت کا عذاب
بحرِ غم کے ہیں، انکھڑیوں میں گرداب
آہوں کے دھوئیں میں گم ہے تیرا مکھڑا
گویا، رُخِ صبح پر ہے کہرے کی نقاب

○

افلاک پہ خندہ زن ہے میری تخئیل
مسجودِ ملائک ہیں مرا نفسِ جلیل
آتا ہے مری فکر کے در پہ لے جوش
پرواز کی بھیک مانگنے کو جبرئیل

(۱۷)

۶ اگست ۱۹۷۵ء

ارے بس! میں نے بڑی لجاجت سے، فون کیا کہ عابد[43] سے یہ دریافت کر کے مجھے فون کر دیجیے کہ میری نقنہ آخرالزماں، کسی تاریخ کو روانہ ہو رہی ہے، لیکن آپ اس خیال سے ٹال گئے کہ آپ کے فون کا بل بڑھ جائے گا۔ اسی کا نام ہے دوستی ؟ دس بارہ روپے بچائے اور میرا دل توڑ دیا۔

جی چاہتا ہے آپ کی اس بخل آلودہ بے مہری پر اس قدر لکھوں کہ آپ کے ماتھے سے پسینے کی بوندیں ٹپکنے لگیں۔ مگر یہ سوچتا ہوں کہ آپ کہیں گے یہ جوش کس قدر احسان فراموش ہے اگر میں نہ ہوتا تو یہ ناشکرا، دل پکڑے پکڑے پھرتا، اس کو تخلیہ میسر نہ آتا، اور اس کے لب و آغوش اس پیکرِ ناز کے لعلِ نگاریں اور اس کے نرم جسم سے لطف اندوز نہ ہو سکتے۔

احسان فراموشی سب سے زیادہ ذلیل عیب ہے، اس لیے آپ کی شکایت کے تمام تلخ د

ترش الفاظ نگل لیے میں نے، اور خیریت اسی میں دیکھی کہ آپ پر لعن وطعن نہ کروں۔
جا، چھوڑ دیا، حافظِ قرآن سمجھ کر۔

آپ کا شکوہ گزار احسان مند

جوشؔ

کہنے دیتی نہیں کچھ منہ سے محبت تیری
لب پہ رہ جاتی ہے، آآ کے شکایت تیری

اسلام آباد

ارے، اپنے محسن سے۔ یہ گفتگو
تفو بر تو اے جوشِ کج بیں تفو!

(۱۸)

۱۲/اگست ۱۹۷۵ء

سنیے صاحب، سرکارِ اولو الامر اقتدار نے فون پر، ارشاد فرمایا ہے کہ ان کی درخواست کراچی جا چکی ہے، اور اسی کے ساتھ ساتھ، یہ حکم بھی دیا ہے کہ میں سفارش کے واسطے، کراچی چلا جاؤں۔ میں نے یوسفی صاحب کو خط لکھا ہے اُن کا جواب آجائے، تو کراچی روانہ ہو جاؤں۔ کیا رائے ہے آپ کی اس باب میں؟ فوراً جواب دیجیے یا فون پر بات کر لیجیے۔

(۱۹)

۱۲/جولائی ۱۹۷۵ء

ہوا میں خنکی تیر رہی ہے اور میرے دل میں الاؤ جل رہا ہے الاؤ۔ سناٹا، فضا کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اور میرے سینے میں قیامت کا شور برپا ہے اور اس قدر کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی ہے۔ کروڑوں ایٹم بم پھٹ رہے ہیں۔ اور تمام گلی کے کتے بھونک رہے ہیں مجھ پر۔ میں حسین ہوں اور تمام کرۂ ارض کربلا ہے۔

پھر بھی داد دیجیے میری سخت جانی، یا بہادری کی کہ دوستوں کے حلقے میں بیٹھ کر قہقہے مارتا ہوں۔ انفس و آفاق کے اسرار پر غور کرتا ہوں، اور ملازمت کے دغدغے بھی سہتا ہوں، ہرچند زندگی

تین عدد موذی، میموں، یعنی مسائل، معاشقے اور معاش میں گھری ہوئی ہے۔ پھر بھی خوش دلی سے باز نہیں آتا، اور برابر پا پوش قلندر" کے نعرے لگاتا رہتا ہوں۔

خورشید کے سے "اَبخَل النّاس" کا چاہنے والا
جوشؔ، جس کا دین و دنیا دونوں میں منہ کالا
پونے تین بجے۔ از کفرستان اسلام آباد

اب رباعیات لکھنے کے بعد چار بج گئے۔

یوں، نیند کا پیمانہ پیا ہے تو نے
جھپّان سے، پلکوں کو، سیا ہے تو نے
مَل مَل کے ہتھیلیوں سے پیہم آنکھیں
آنچل نظروں کا چین دیا ہے تو نے

اللہ اللہ، یہ کراہیں تیری
ہر آن، یہ سسکیاں، یہ آہیں تیری
اے رشکِ سمن، کہیں نہ کٹ کر رہ جائیں
پلکوں کے جھپکنے سے نگاہیں تیری

مکھڑا ہے دھواں دھواں، نظر، عرق گداز
للہ، نہ رو، نہ رو، مری پیکرِ ناز
میرے دل پر، چلا رہی ہے چھُریاں
تیری۔ یہ ہچکیوں سے کٹتی آواز

نیندیں، کیا کیا، دھواں بنائیں ہم نے
آنکھوں کے الاؤ میں جلائیں ہم نے
جھیلی ہیں، جدائی میں وہ راتیں بھی کہ جب
آنچیں اوڑھی، لوئیں بچھائیں ہم نے

العظمتہ للہ، یہ آنچوں کا خروش
رگ رگ ہے، شرارۂ خرمن و شعلہ فروش
اُف، دل میں وہ آگ ہے کہ میرے نزدیک
دوزخ آتا ہے، تاپنے کو اے جوش

سکی جو ہوا، جاگ اٹھے ہنگامے
بجتے لمحات نے کلیجے تھامے
چھیڑی گئی راگنی، سرِ بزمِ طرب
بھیجے گئے، ہچکیوں کو دعوت نامے

خود حسن جب، آشفتہ نوا ہوتا ہے
آفاق میں، اک حشر بپا ہوتا ہے
کانٹوں سے جو زخمی ہیں، وہ یہ کیا جانیں
ڈس لیتا ہے جب پھول، تو کیا ہوتا ہے

(۲۰)

۲۱ر اگست ۱۹۷۵ء

میں تو بڑے "لفڑے" میں پڑا ہوا ہوں، خورشید صاحب۔ خوب جانتا ہوں، یہ موسم اِن لغویات کا نہیں ہے۔ لیکن کیا کروں، میری عقل گدھوں کی کھائی ہوئی جھوٹی گھانس چر رہی ہے اور میرے سینے کا لونڈا، عقل کو ٹھینگا دکھا دکھا کر بیٹیاں بجا، اور "ہپ ہپ ہرّا" کر رہا ہے۔

تھوک، میری اوقات پر، لعنت میری ذات پر

بڑا مفکر بنا پھرتا ہے سالا، اور اندر اتنا "گڑ بڑ جھالا"

اگر غیرت ہوتی تو، ڈوب مرتا، چلّو بھر پانی میں۔ لیکن میں تو "منہ پر پھیری لوئی، تو کیا کرے گا کوئی۔" کی حد تک بے حیا ہو چکا ہوں۔

قابلِ صد ہزار نفرین :۔ جوش ناعاقبت بیں

اسلام آباد۔

سہ پہر

(۲۱)

۱۲، اکتوبر ۱۹۷۵ء

بار بار جی چاہا کہ آپ کو خط لکھوں، لیکن جب یہ سوچا کہ آپ بربنائے بخل، جب مجھے کبھی فون ہی نہیں کرتے، تو پھر میں خط کیوں لکھوں۔

کل، دوپہر کو آپ کا خط آیا۔ اس لیے مجبوراً خط لکھ رہا ہوں۔ جی ہاں، مجبوراً، دل اس وقت بھی یہی کہہ رہا ہے کہ جواب ٹال جاؤ، بخیلوں سے کیسی رسم و راہ۔ بخیل ار بود زاہد بحر و بر
بہشتی نہ باشد، بحکم خبر!

اس وقت بیس منٹ ہیں، دو بجنے میں، رات اندھیری ہے۔ محلّے کے کسی مکان سے ابھی شور کی آوازیں بلند ہوئی تھیں، اب سناٹا طاری ہے۔ سامنے کی کھڑکی سے کوئی مجھے گولی مار دے گا بار بار یہ خیال آ رہا ہے، اچھا ہے، کوئی "اللہ کا بندہ، گولی مار دے" اور، اس، ہر آن دھڑکنے والے دل کو سکون بخش دے۔

جی ہاں، بہت جی چاہ رہا ہے ہندوستان جانے کو، آپ کا سا بخیل ساتھ ہوگا تو کروٹ کروٹ حوریں ہوں گی — لیجیے پھر آ گیا پیار آپ پر، ہو نہ ہو، میں بھی، اندر سے، تھوڑا بہت بخیل ضرور ہوں گا۔ کند ہم جنس، با ہم جنس پرواز۔

لاہور، مکمل خاموشی ہے، نہ پیام ہے نہ سلام، دل کم بخت زندھا گھٹا جا رہا ہے، سانس اٹک اٹک کر آ رہی ہے، یہ خموشی جان لے کر چھوڑے گی۔ دونوں پاؤں پر ورم آ گیا ہے، لوگ کہتے ہیں علاج کیجیے، یہ بڑی خطرناک علامت ہے۔ میں کہتا ہوں، جوتی کی نوک سے، کل، آنے والی موت آج ہی آ جائے، کون سے لڈو بٹ رہے ہیں، اس حرام زادی زندگی میں؟ لڈو بٹنا تو درکنار یہاں تو، برچھے لگ رہے، دن رات۔ کھچا کھچ۔

کاش میں، سنگ دل خورشید علی خاں ہوتا، جو، اپنی چاہنے والی کو، ایک پھریری لے کر، بھلا دیتے ہیں۔ ہائے شفقی ہونا، کتنی بڑی نعمت ہے۔ اے اللہ، مجھ پر کرم فرما، اور میرے سینے کو، شمر کا دل عطا فرما دے۔

ہلالؔ نقوی

(۱)

۶/۲ ایف اسٹریٹ نمبر ۶۰
اسلام آباد
۸ راگست ۱۹۷۷ء

میاں ہلال نقوی
خوش رہو بیٹے۔

تمھارے کئی خطوط ملے، کچھ کے جوابات بھی دیے۔ بہت بیمار ہوں۔ زیادہ لکھنے کی طاقت اب باقی نہیں رہی۔ تمھارا تحقیقی مقالہ کس منزل پر ہے؟ میرا مسدس "آگ" کسی سے مل سکا یا نہیں۔ تم اپنے سوال کے جواب میں میری یہ عبارت اپنے مقالے میں لکھ سکتے ہو ـــــ "میں آج تک خود استاد بن نہیں سکا ہوں، پھر شاگرد کس کو بناؤں۔ بہ ہر حال میں نے (غالباً ۱۹۶۹ء میں) ہلالؔ کے ایک مرثیے پر کہیں نہ کہیں اصلاح کی ہے۔ اس لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ ہلالؔ جو کل ماشاءاللہ بدرِ کامل بننے والا ہے میرا اوّلین شاگرد ہے۔ دورانِ اصلاح میں نے ہلالؔ کی فکر پر اپنی فکر کے پہرے بٹھلانے کی قطعی کوشش نہیں کی، جہاں بہت ضروری خیال کیا اور زبان میں کوئی نقص دیکھا، اصلاح کی اور فکری رُخ میں کبھی دیوار نہیں بنا، یہی میرا طریقۂ اصلاح ہے بیٹے۔ تم اب میری موت کی خبر سننے کے لیے تیار رہو۔ تمھارا قلمی مرثیہ "کائناتِ انقلاب" بھی مل گیا ہے۔ دو ایک روز میں اس پر مضمون لکھ کر بھیج دوں گا۔"

جوشؔ ملیح آبادی

(۲)

۲۹ر جون ۱۹۷۸ء۔

اسلام آباد

میاں ہلالؔ، درخشاں باد

اس وقت، میری ذہانت کا چراغ بُجھا ہوا ہے۔ اس لیے کہ خلافِ معمول تاخیر سے بیدار ہوا ہوں۔

سہرا کہنا تو بڑی بات ہے۔ مجھ سے تو یہ خط بھی لکھا نہیں جا رہا ہے۔ خط اس طرح لکھ رہا ہوں، جس طرح کمزور بینائی والا سُوئی کے ناکے میں ڈورا ڈالتا ہے۔ کیسے بتاؤں کہ رسمِ ازدواج، محبت کا گلا گھونٹ کر رکھ دیتی ہے اور شوہر صاحب کا احساسِ ملکیت زوجہ کے حُسن کو نِگل لیتا ہے۔

ابھی تم اور نسرین طالب و مطلوب ہو، کل شوہر و زوجہ میں تبدیل ہو جاؤ گے اور چند روز کے بعد تم دونوں کا قُرب مسلسل ہزاروں میل کا بُعد بن جائے گا۔

جب تک شادی نہ ہو، معشوقہ محمل نشین لیلیٰ ہوتی ہے، اور شادی کے بعد وہ انگنائی میں بندھی ہوئی گائے میں تبدیل ہو کر رہ جاتی ہے۔

ہلال میاں، مبارک ہو۔ کل بدر بن جانے کے بعد تمھاری آب و تاب میں تو ضرور اضافہ ہو جائے گا۔ مگر بانکپن باقی نہیں رہے گا۔

مبارک باد کڑم دھم، کڑم دھم!

جھنکی جو ہَوا جاگ اُٹھے ہنگامے
بجتے ہوئے لمحوں نے کلیجے تھامے
چھیڑی گئی راگنی سحرِ بزمِ طرب
بھیجے گئے ہچکیوں کو دعوت نامے

تم دونوں کا خیر خواہ
جوشؔ

(۳)

۱۴ر اگست ۱۹۷۸ء
اسلام آباد، قبل طلوع

ہلالؔ میاں!
اُردو بورڈ کے حوالے سے نسیمؔ امروہوی صاحب کی خدمات پر میں کیا لکھوں،
بورڈ سے میرا تعلق زیادہ عرصے تک قائم نہیں رہ سکا۔ وہ یقیناً بہت عالم آدمی ہیں۔
لفظ پر نسیمؔ امروہوی کی علمی گرفت کا میں معترف رہا ہوں۔ اتنے محنتی اور مشفق
لوگ اب ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتے۔
مجتبیٰؔ اور شعورؔ کو میرا پیار پہنچا دینا۔ نسرین کو دعا۔

تمہارا
جوشؔ

(۴)

۲۴ر ستمبر ۱۹۸۰ء
۳/۶ اسٹریٹ نمبر: ۶۰
اسلام آباد

میاں ہلال نقوی
خوش و خرم رہو!
تمہارے خطوط کا جواب کیسے دیتا، ہاتھ تو کانپتے ہی تھے اب قوتِ سماعت و بصارت نے بھی
کنارہ کشی اختیار کرنا شروع کر دی ہے۔ چشمہ تو استعمال کرتا ہی تھا اب آلہ سماعت کا بھی سہارا لینا پڑ گیا
ہے۔ یہ خط خود نہیں لکھ رہا۔ اُف ہے جوشؔ کی مجبوریوں کے اس دور پر، سوچتا ہوں کہ اُس کی کن کن نعمتوں
کا شکر ادا کروں۔
تم نے جمیلؔ مظہری کا شکایتی قطعہ بھیجا تھا "یادوں کی برات" میں نہ صرف جمیلؔ مظہری بلکہ دوسرے

دوستوں کا بھی ذکر تھا مگر نہ جانے کیا گڑبڑ ہوئی کتاب چھپنے گئی تو اس کے اصل مسودات میں سے بعض تذکرے کوئی لے اُڑا۔

لکھنؤ سے تمہارا خط آیا تو وہاں کے گلی کوچے اور کوٹھے نظروں کے سامنے آکر کھڑے ہوگئے۔ لیکن جمیل مظہری[9] کے انتقال کی خبر پڑھی تو تصورات کا یہ محل گر کر تباہ ہوگیا۔ ہائے جمیل مظہری! کیا کہوں! کیا لکھوں کیا کروں سب نے ساتھ چھوڑ دیا، کس کس کا ماتم کروں۔ اب تو میری موت پر آنسو بہانے والا پرانا دوست شاید ہی کوئی باقی ہو۔

تم نے ہندوستان کے مرثیہ نگار عظیم امروہوی[10] کے مرثیے پر تبصرہ لکھنے کی فرمائش کی ہے، لیکن صحت کی خرابی اب اس قسم کے کام نہیں کرنے دیتی۔ کل ایک صاحب سے مرثیے کے کچھ بند پڑھوا کر سنے۔ یہ بات وجہ مسرت ہے کہ ہندوستان کا نوجوان شاعر فکر و نظر سے کام لے رہا ہے اور حسینؑ ابن علیؑ کے معرکۂ حق سے درسِ عمل دینے پر آمادہ نظر آتا ہے، لیکن افسوس کہ سننے والوں کے کانوں پر جوں نہیں رینگے گی اور شاعر کی ہر کوشش رائیگاں چلی جائے گی۔ اب مرثیے کو روشن دماغ نوجوانوں کی ضرورت ہے ورنہ اس صنف کا وجود ختم ہوجائے گا۔ عظیم امروہوی قابلِ مبارک باد ہیں کہ انھوں نے ایک عظیم انسان کے مرثیے کو نئے احساسات کی آب و تاب دے کر لکھا ہے۔

اب مجھے کچھ یاد نہیں کہ میں نے کون سا مرثیہ کس سنہ میں لکھا تھا۔ اگر تمہاری اہلیہ میری شاعری پر پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے تحقیقی مقالہ لکھنا چاہتی ہیں تو شوق سے لکھیں، وہ تمہاری رہنمائی میں یہ کام بہتر طور پر کرسکیں گی۔

تم دونوں کا خیر خواہ
جوشؔ

(۵)

۱۷ر جون ۱۹۸۱ء

اسلام آباد

پیارے ہلال! تحقیقی نوعیت کے سوالوں کے جوابات دیتے ہوئے مجھے اپنی طبیعت

پر بہت جبر کرنا پڑتا ہے۔ یہ معاملات میرے مزاج کے بالکل برعکس ہیں۔ تم نے جس سوال کا جواب چاہا ہے، وہ بہت تفصیل چاہتا ہے، اور کمزوری ہے کہ بدن توڑے دے رہی ہے۔ زیادہ لکھتا ہوں تو حروف کی شکلیں مسخ ہونے لگتی ہیں۔

میں نے اس پر کبھی اصرار نہیں کیا کہ میرے "مُسَدّسوں" کو مرثیے کہا جائے۔ مجھے اس سے سروکار نہیں ہے کہ انھیں آپ مرثیے کا نام دیں یا نہ دیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ میرے پیشِ نظر اس قسم کے مسدس لکھتے وقت مرثیے ہی کا تصوّر رہتا ہے۔ میرا موضوع، ان مرثیوں میں جب کربلا، حسینیت، عزمِ شہیدانِ کربلا، بے باکی اور حق گوئی ہوتا ہے تو پھر "نقادوں" کی یہ رٹ کہ جوشؔ کے مُسَدّس جدید مرثیے نہیں ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتی — اب اس سے زیادہ لکھنے کی ہمّت باقی نہیں۔

تمھارا بیمار جوشؔ
اسلام آباد

بصیغۂ راز

سیّدہ اختر

ایک تاریخی حادثہ

(۱)

اختر تابندہ، یہ خط نہیں ہے، میں آج اپنے دل کا تمھیں گھاؤ دکھا رہا ہوں اور ہر طرف سے مایوس ہو کر تمھیں یہ خط لکھ رہا ہوں۔ میں نے ہر ممکن سعی کی کہ جس طرح بھی بن پڑے تم کو ہرگز تکلیف نہ دوں لیکن آج تھک کر اور عاجز ہو کر یہ چند سطریں لکھ رہا ہوں۔

تمھیں کیوں کر سمجھاؤں کہ اس خط کے لکھنے میں میرے دل کو کیسی شدید ترین تکلیف ہو رہی ہے۔ یہ ایک عجیب سانحہ ہے۔

دنیا میں حقیقی بھائیوں کے درمیان بہت کم خلوص ہوتا ہے۔ خلوص تو بڑی چیز ہے، بھائیوں کے مابین تو اکثر و بیشتر ایسی عداوتیں ہوتی ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوتے ہیں، لیکن میرا اور میرے چھوٹے بھائی رئیس احمد خاں کا معاملہ، رسمِ عالم سے بالکل برعکس واقع ہوا ہے، اور ہم دونوں بھائیوں میں اس قدر محبت ہے جس کی کوئی حد و نہایت نہیں۔

رئیس احمد کی جائداد انکبرڈ میں تھی اور اُس کا فیصلہ عدالت نے اُن کے موافق کر دیا تھا، لیکن مہاجن نے جب اپیل کی تو وہ جیت گیا۔ آپ جانتی ہیں اُسے کس نے جتایا ــ؟ مسلمانوں کے ہمدرد اور مسلم لیگ کے رُکنِ خاص محمد نسیم صاحب وکیل نے۔ خیر، جو ہوا سو ہوا۔

اب صرف دو ہی صورتیں ہیں:

(۱) یا تو مہاجن کا تمام قرض جو تیس ہزار ہے ادا کر دیا جائے،

(۲) یارِ   ہاتھ سے نکل جائے، اور وہ کوڑی کوڑی کو محتاج ہو جائے۔
۔میرا تو یہ لکھ کر سر گھومنے لگا۔۔۔ ذرا ٹھہر کے لکھوں گا۔

(پندرہ منٹ کے بعد)

تم اختر اس صورتِ حال کو سمجھیں، یا تو دل کڑا کر کے رئیس کا قرض ادا کر دو، یا دل کو پتھر بنا کر رئیس کو برباد ہو جانے دو۔ کیا تم اپنے فرشتہ سیرت شوہر سے کہو گی؟ اب یہ دریافت کرو کہ یہ روپیہ ادا کیوں کر ہوگا؟ سو اُس کی صورت یہ ہے کہ عنقریب میری ڈھول پور کی جاگیر کا فیصلہ ہونے والا ہے۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ جاگیر کے ساتھ ساتھ اُس کی جمع شدہ آمدنی بھی جو ڈھائی سال سے صیغۂ امانت میں جمع ہو رہی ہے، مجھے مل جائے گی اور ایک غیرت مند شریف انسان کی طرح میں فوراً تمہارا روپیہ ادا کر دوں گا۔ مجھے ڈھول پور سے ستر اسی ہزار روپیہ ملے گا۔

میں تمہیں اختر کبھی تکلیف نہ دیتا اور اپنی جاگیر کے روپے کا انتظار کرتا، مگر کیا کروں، عدالت کا معاملہ ہے، اگر مزید تاخیر ہو گئی تو میعاد نکل جائے گی۔

اگر تم اور تمہارے محبوب شوہر اس وقت میرے بھائی کی جائداد اور زندگی کو خطرے سے بچانے پر آمادہ ہوں تو مجھے تار کے ذریعے سے فوراً بلا لو۔ پہلے سے میں نے اس لیے لکھ دیا کہ بنگلور آ کر میرے دل کو دھکا نہ لگے۔ (براہِ کرم پلٹو)

دماغ میرا صحیح نہیں ہے اس وقت۔ تمہیں پورے تیس ہزار دینا نہیں پڑیں گے۔ پندرہ ہزار روپیہ فراہم کر کے میں رئیس احمد کو روانہ کر چکا ہوں۔ اب صرف پندرہ ہزار کی کمی ہے (اور اگر اس عشرے کے اندر پانچ ہزار مل جائیں گے تو اپیل دائر ہو جائے گی اور عدالت میں درخواست دے کر مزید مدت حاصل کر لی جائے گی اور اس طرح باقی دس ہزار کے فراہم کرنے کا وقت مل جائے گا) لیکن یہ اس صورت میں ہوگا، اگر تم صرف پانچ ہزار دو گی لیکن تم نے ہمت سے کام لے کر اگر پورے پندرہ ہزار دے دیے تو پھر کوئی جھگڑا باقی نہیں رہ جائے گا۔

، بولو کیا کہتی ہو؟ صرف پانچ ہزار یا پورے پندرہ ہزار؟ محبت کے امتحان کا وقت ہے بس۔

روپیہ بھی کیسی کمبخت چیز ہے۔ قرض مانگنے سے پیشتر موت آجانا کتنی بڑی رحمت ہے۔

تمہارا
جوشؔ

جواب ذیل کے پتے سے دینا

IDEAL WATCH HOUSE
57, MAIN STREET,
POONA (U.P.)

اور تار دینا تو اس پتے سے دینا :

TAHER PALACE
SHAN SETH ROAD,
POONA (2)

(۲)

شفیقہ !

میرے ایک نہایت ہی قریبی عزیز آج کل سخت پریشان ہیں۔ اگر آپ مہربانی کر کے ان کے واسطے کوئی روزگار فراہم کر دیں یا اپنے شوہر کے محکمہ میں کھپا دیں تو یہ احسان اُن پر نہیں میری گردن پر ہوگا۔

نیازمند
جوشؔ

(۳)

محترمہ !

آپ دبے پاؤں پونا اسٹیشن سے گزر گئیں۔ ٹھہرنا تو درکنار آپ نے گذرنے تک

کی اطلاع نہ دی۔ آپ نے میرے ابن عم کا دو سو روپے کی ملازمت کا انتظام کردیا ہے۔ اس کا دلی شکریہ قبول فرمایئے۔ مجھے آپ کے خلوص سے یہی اُمید تھی۔ میں آپ کے خلوص کا شکریہ تو اس وقت ادا کروں گا جب آپ بمبئی سے واپسی میں کچھ گھنٹے کے لیے پونا ٹھہریں، اور مجھے میزبانی کا شرف عطا کریں۔ کیوں کہ آپ کی دریا دلی کے شکریے سمندر کے سامنے ادا کیے جائیں تو مناسب ہے۔ یا بمبئی سے تار دے کر مجھے طلب کیجیے، یا پھر پونا میں چند گھنٹے گزار لیجے۔

نیاز کیش و وفا کیش
جوشؔ

(۴)

ناہیدۂ سخن!

عین انتظار میں آپ کا پیارا خط ملا۔ دل پر ایک سرور کی کیفیت چھا گئی۔ جی چاہا اُڑ کر آپ تک پہنچ جاؤں، مگر حالات پر نگاہ کر کے اس طرح سر جھکا لیا۔ جیسے مور اپنے پاؤں دیکھتے ہی رُک جاتا ہے۔ آپ ذرا تفصیل کے ساتھ اپنا پروگرام تحریر فرمائیں اور یہ بتائیں کہ آپ یقینی طور پر بنگلور میں کب تک مقیم رہیں گی۔ میں کوشش کروں گا کہ دسمبر میں بنگلور پہنچ کر آپ اور آپ کے قابلِ محبت شوہر کے دیدار سے مسرور و مشرف ہوں۔ زمانہ میرے ارادوں کو توڑتا رہتا ہے۔ خدا نہ کرے کہ ظالم اس اس ارادے کو بھی توڑ دے۔ سنا ہے آپ نے چار تصانیف شائع کی ہیں۔ اپنے ناشر کو لکھ دیجیے وہ میرے نام وی۔ پی کر دے۔ ہم لوگ بمبئی میں ایک پبلشنگ ہاؤس کھولنے والے ہیں جس کے ڈائرکٹروں اور سرپرستوں میں آپ کا نام بھی ہوگا۔ تفصیل اگر آپ آئیں تو زبانی بیان کر دوں گا۔ اس سلسلے میں مسز نائیڈو، سر تیج بہادر سپرو، سر کیلاش نارائن ہکسر، مسٹر بانیکار، راجہ صاحب آف محمود آباد و نان پارہ، مہاراجہ پٹیالہ کو بھی ڈائرکٹر اور سرپرست بننے کی درخواست کی گئی ہے جن میں سے بعض کی منظوری کے جوابات آچکے ہیں اور بعض کے جوابات کا انتظار ہے۔ آپ کا مجموعۂ کلام کب شائع ہو رہا ہے۔ اگر ابھی شائع نہ ہوا ہو تو مہربانی کر کے ٹھہر جایئے۔ اسے ہم شائع کریں گے۔ یہ ہماری

آرزو ہے۔

سمجھو تو اسی پردے میں کہہ جاتا ہے سب کچھ
جو تم سے یہ کہتا ہے کہ میں کچھ کہہ نہیں سکتا

آپ کا
مرحوم جوش

(۵)

نا بیدۂ سخن۔ سلام شوق قبول کریں

میں نے جیسا کہ لکھا تھا فلم کے بارے میں احمد صاحب سے گفتگو کی لیکن اس بنا پر کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکل سکا کہ وہ اپنے سرمایہ سے اس قدر مطمئن ہیں کہ کسی دوسرے کی شرکت کو پسند نہیں کرتے اس کے بعد بمبئی گیا اور یہاں چند اصحاب کی معرفت معلوم ہوا کہ وہاں فلم لائسنس خرید سکتے ہیں۔ آج کل کسی نئی کمپنی کو لائسنس کا ملنا ازروے قانون امکان سے خارج ہے۔ اور اس وقت لائسنس کے حصول کی یہی واحد شکل ہے کہ جن لوگوں کے پاس پہلے سے لائسنس موجود ہے ہم ان سے لائسنس خرید لیں۔ میرے نزدیک یہ ایک بڑا نادر موقع ہے جس سے ہر ممکن عجلت کے ساتھ فائدہ اُٹھانا چاہیے۔

لائسنسوں کی قیمت چالیس ہزار ہے، جو کہ اس نایابی کے زمانے میں ایسا سودا ہے جسے کوڑیوں کے مول خریدنا کہتے ہیں۔ فلم سازی کے آغاز کے لیے جو مرکزی اور بنیادی چیز ہے، وہ لائسنس ہے۔ چونکہ لائسنس کا حصول ہمارے واسطے حسنِ اتفاق سے بہ آسانی ممکن ہو گیا ہے اسی لیے ہمارے لیے بہت ہی آسان ہے کہ ہم بمبئی کے وسیع تجارتی شہر میں اپنی کمپنی کے واسطے سرمایہ حاصل کریں۔ کیوں کہ ہر سرمایہ دار بخوبی سمجھتا ہے کہ صنعت فلم سازی میں آجکل یہی نہیں کہ نقصان کا قطعی طور پر امکان نہیں بلکہ فائدہ اور کثیر فائدہ تعینات سے ہے لیکن بنگلور میں آپ سے اس صنعت کے متعلق گفتگو ہو چکی ہے اور آپ سے میں نے درخواست کی تھی کہ آپ اس صنعت سے دلچسپی لیں۔ اس لیے ایک مخلص نیازمند کی حیثیت سے میں اپنا فریضہ سمجھتا ہوں کہ سب سے پہلے آپ کو شرکت کی دعوت دوں اور اس میں میری خودغرضی

بھی ہے کہ اس صورت میں میں آپ کو قریب سے دیکھ سکوں اور آپ کی شعر و شاعری سے لطف اندوز ہو سکوں۔ اب معاملے کی بات سنیے!

جس سے جی گھبراتا ہے لیکن کہنا ہی پڑ گیا ہے وہ یہ کہ اس کی دو شکلیں ہیں۔ ایک تو ہے کہ آپ جیسا کہ عام رواج ہے۔ ہماری کمپنی کو ایک فلم کے لیے دو لاکھ روپے فلم کمپنیوں کے شرائط یعنی دس فیصد سود پر عنایت کریں۔ یہ صورت آپ کی پسند ہو یا نہ ہو۔ مجھے اس وجہ سے پسند نہیں کہ یہ محض ایک کاروباری رشتہ ہے اور اس سے میں آپ اور آپ کے شوہر محترم کے قرب سے محروم رہ جاؤں گا۔ دوسری صورت جسے میں ہر طرح مطبوع سمجھتا ہوں یہ ہے کہ آپ ہماری برابر کی شریک ہو جائیں۔ "ہماری" کا مطلب یہ ہے کہ ایک میں، دوسرے آپ، ایک پارٹی جو ہمیں لائسنس فراہم کر رہی ہے اور جس کے تجربے اس صنعت میں ہر طرح قابلِ اعتماد ہیں اس طرح عمل یوں ہو گا کہ ہم لائسنس فراہم کریں گے، اداکاروں کو جمع کریں گے۔ فلم سازی کا تمام دردِ سر ہمارے ذمہ ہو گا اور سرمایہ فراہم کرنے کی تمام ذمہ داری آپ کے سر ہو گی۔ اس دوسری شکل میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ آپ کی قانونی شرکت و مداخلت مسلح رہے گی۔ (کذا)

ب۔ آپ کو اچھے اور تجربہ کار کارکن مل جائیں گے، جن کی موجودگی سے کثیر منافع حاصل کیا جا سکتا ہے۔

ج۔ ہم آپ قریب رہ سکیں گے اور اس طرح اُردو کی خدمت بھی ہوتی رہے گی۔

اس خط کا جواب مہربانی فرما کر جلد سے جلد دیجیے، تاکہ اگر آپ آمادہ ہوں تو آپ کی مدد سے لائسنس خریدنے کے لیے عملی قدم اُٹھاؤں۔ بفرضِ محال آپ تیار نہ ہوں تو دوسرے سرمایہ داروں کی طرف رجوع کر دوں۔ آپ اور آپ کے محترم شوہر دونوں نے میرے خطوط کا جواب نہیں دیا جس سے یک گونہ تشویش ہے۔ اور ساری تشویش اس بات کی ہے کہ وہ روپیہ جو آپ نے اسٹیشن پر زادِ راہ کے طور پر دیا تھا میں نے تھوڑے سے تامل کے بعد اسے قبول کیا۔ اس سے کہیں آپ نے بُرا نہ مانا ہو۔ براہِ کرم جلد از جلد جواب دیجیے۔ میری طرف سے اپنے شوہر محترم کی خدمت میں سلام شوق کے بعد کہہ دیں کہ میں اوائل ۱۹۴۲ء

میں بنگلور آؤں گا۔ اس خط کا جواب جلد سے جلد مندرجہ ذیل پتہ سے دیجیے گا۔

آپ کا نیاز مند
جوشؔ

(۶)

پیاری اختر!

خدا کا شکر ہے کہ تم نے میرے پے بہ پے خطوط کا جواب دیا۔ تمہارا خط ملا، دل باغ باغ ہو گیا۔ تمہاری صورت آنکھوں کے نیچے پھرنے لگی۔ تم جس زمانے میں دہلی آئی تھیں، وہ موسم کے لحاظ سے بدترین زمانہ تھا اور اس کے علاوہ میں ان دنوں پریشان بھی تھا۔ شرم کے مارے تم سے بیان بھی نہ کر سکا۔ اب جب کہ بارش کا آغاز ہو چکا ہے۔ مُوسلا دھار پانی برس رہا ہے۔ اس وقت تمہارا یہاں نہ آنا بہت سخت جُرم ہے۔

"سکھی رُت آئی بھیگن کی"

آؤ اور تمھیں جوانی کی قسم آؤ۔ ساحر تمھیں لکھ چکے ہیں۔ کہو کب آتی ہو؟ اگر خدانخواستہ تم نہ آئیں تو برسات خشک ہو جائے گی، گھٹاؤں کا سُہاگ جل جائے گا اور کوئل کی آواز تھم جائے گی۔ کہو اس قدر ظلم رَوا رکھو گی۔ یا چلی آؤ گی؟ ؎

تم کو کیا کیا یاد کرتا ہوں اندھیری رات میں
جب پپیہا کوک اُٹھتا ہے بھری برسات میں ؎

تمہاری آمد کا منتظر
وہی جوشؔ خانہ خراب

(۷)

پیاری اختر۔ راج دلاری اختر!

تو نام خدا تم ۱۵ نومبر ۱۹۵۲ء کو یہاں (دہلی) آ رہی ہو۔ زبانی باتیں کر لوں گا۔ جواب خط نہ آنے سے اس بات کا خدشہ ہوا کہ تم روٹھ گئی ہو۔ اس لیے منانے کی خاطر یہ چند سطریں لکھ رہا ہوں۔ اس توقع پر کہ دہلی میں غنی صاحب کے معاملات میں

تفصیل سے گفتگو ہو سکے گی اور میں ان کی خدمت میں اپنی مخلصانہ خدمات پیش کرنے کا موقع پاؤں گا۔

تمہارا
جوشؔ

(۸)

خطیبہ ہند، یاد آوری کا شکریہ قبول کیجیے۔ اس سے پیشتر کہ میں آپ کے نوازش نامے کا جواب دوں، چند کلمے اس سلسلے میں کہنا چاہتا ہوں، کہ میرا دل چاہتا تھا کہ دہلی میں آپ کے پاس آؤں لیکن نہیں آسکا اور نہ آپ کی خدمت ہی کر سکا۔ اور نہ مقدمے کے سلسلے میں جیّن صاحب سے ملنے کا موقع ملا اور یہ کام حسب مُراد خود پنڈت نہرو کے توسط سے بخوبی انجام پا گیا اس کے اسباب کیا تھے۔ کس میں طاقت ہے کہ وہ انھیں تفصیل کے ساتھ لکھ سکے۔ آپ اس محبت اور خلوص پیار کی پاکیزگی سے واقف ہیں جو مجھے آپ سے آپ کے فرشتہ خصلت شوہر سے ہے بس آپ کو اسی محبت اور پیار کا واسطہ۔ اسی پر نظر کر کے مجھے معاف کر دیجئے اور میری بیچارگیوں پر ترس کھائیے۔ اب رہا مقدمہ اور ان کا معاملہ سو اس مسئلے میں کسی لمبی چوڑی تحریر کی ضرورت نہیں۔ جب کہ آپ نے خود اس مہم کو نہ صرف اپنے لیے بلکہ تمام مسلمانوں کے لیے بھی سر کی ہے اور فوائد کی صورت پیدا کی ہے اور آپ کی اس سلسلہ جنبانی سے مسلمانوں کو ہندوستان گیر فائدہ پہنچا ہے۔ یہ آپ کا حدِ کمال ہے کہ جوالیا کی (کذا) کو حسبِ منشاء طے ہو جانے کی سبیل نکالی ہے۔ میں مطمئن ہوں اور اپنی کاہلی کی وجہ سے آپ کے اس کام میں کوئی مدد نہیں کر سکا۔ بچّے کو پیار۔ خانصاحب کو ہم آغوش اور سلام شوق۔

نیاز مند قدیم
جوشؔ

حضرت دلؔ شاہجہاں پوری

(۱)

محترمی "ترانۂ دل" نظر نواز ہوا۔ اس التفاتِ خاص کا شکریہ کیوں کر ادا کروں۔
نگار میں جو میری تحریر شائع ہوئی ہے وہ ایک پرائیویٹ چیز تھی۔ نیازؔ نے بددیانتی سے
شائع کر دی۔ آپ کی داد کا شکریہ۔ اپنی خیریت سے گاہ گاہ مطلع فرماتے رہیے۔ آپ کی ذات
گرامی اردو زبان کے حق میں ایک نعمتِ غیر مترقبہ ہے۔

نیاز مند
جوشؔ

(۲)

مدیر جوشؔ ملیح آبادی

دہلی
۱۳ر نومبر ۱۹۳۵ء

برادرِ مکرم۔ السلام علیکم
رسالہ اب انشاء اللہ ہفتے عشرے میں شائع ہو جانے والا ہے۔ کچھ پوسٹر اس غرض سے
بھیجے جا رہے ہیں کہ آپ انھیں مناسب مقامات پر چسپاں کرا دیں کہ عام طور پر لوگوں کی
نظر سے گزر جائیں۔ تکلیف دہی کا معافی خواہ
جوشؔ

(۳)

۱۶ مارچ ۱۹۵۵ء

محترمی، یاد آوری کا شکریہ قبول فرمایئے۔

آپ کے سفینے کو دریا میں ڈال دیا گیا ہے، اور بادِ مراد سے درخواست کی گئی ہے کہ وہ اُسے حرکت میں لا کر ساحل تک پہنچا دے۔

با ارادت فراواں

نیاز مند

جوش

دہلی [illegible] ۲۵ فروری

بخدمت جوش ملیح آبادی

برادر مکرم — السلام علیکم — [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

جوش

۱۶ مارچ ۱۹۵۵ء

محترمی، یاد آوری کا شکریہ قبول فرمایئے۔

آپ کے سفینے کو دریا میں ڈال دیا گیا ہے، اور بادِ مراد سے درخواست کی گئی ہے کہ وہ اُسے حرکت میں لا کر ساحلِ مطلوب تک پہنچا دے۔

با ارادت فراواں

نیاز مند جوش

ڈاکٹر صفدر آہ سیتاپوری

(۱)

اولڈ سیکریٹریٹ دہلی
۱۴ اکتوبر ۱۹۵۴ء

بھائی اس خیال میں اس قدر مدت گزر گئی کہ آپ کو فرصت نکال کر خط لکھوں گا۔ مگر یہ دیکھ کر کہ فرصت نکل نہیں رہی ہے۔ یہ خط گھبرا کر لکھ رہا ہوں کہ کہیں آپ کو جواب نہ دینے کی شکایت نہ پیدا ہو جائے۔ آپ کی نظم کے مطالعے کا ابھی تک وقت نہیں مل سکا ہے۔ لیکن جانتا ہوں کہ "آہ" کی نظم کیسی ہوگی! یہ خط نہیں آپ کی نظم کی محض رسید ہے۔ اس لیے بھائی برا نہ مانیے گا کہ میں آپ کو اس طرح بصد ہزار عجلت خط لکھ رہا ہوں۔

دو چار روز میں وقت نکال کر آپ کو لکھوں گا۔

بچے کو دعا اور اپنے کو پیار۔

آپ کا شیدائی۔
جوشؔ مرحوم۔

لفافے کا پتہ انگریزی میں ہے۔ حضرت آہ۔ ۱۲۸۔ والکیشور روڈ بمبئی (۶)

حکیم جمیل خاں

مکرمی !

حاملِ رقعہ کے حال پر جو متصل و مسلسل کرم فرمائیاں آپ کرتے رہے ہیں، اس سلسلے میں آپ اگر ان کی تازہ پریشانی کو دُور فرمانے میں مزید دستگیری کریں گے تو اُن کے ساتھ ساتھ ان سطور کا راقم بھی آپ کا بہت شکر گزار ہوگا۔ اُمید ہے کہ مزاجِ گرامی بخیر ہوگا۔

نیازمند
جوشؔ

تمکین کاظمی

(۱)

دہلی

۲۹ر جنوری ۱۹۲۸ء

کیوں حضرت، مومن کے کلام پر رائے لینے کا جب موقع آیا تو آپ نے اس شخص کو یاد فرمایا جسے آپ مُردہ سمجھ کر دل سے بُھلا بیٹھے تھے۔ میں پوچھتا ہوں آپ نے اب تک کیوں دریافت نہیں فرمایا کہ جوش زندہ ہے یا مر گیا۔ رہا یہ امر کہ میں نے خط کیوں نہ لکھا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ کس کا فرکو آپ کا پتا معلوم تھا۔ اب رہے حیدر آباد کے دوسرے احباب، سو ان بے چاروں ہی کو خط لکھنے کی کب توفیق ہوتی ہے۔ اس قدر ہولناک صورت سے مشغول رہتا ہوں کہ خود سے بھی اب گاہے ماہے کی ملاقات رہ گئی ہے۔

آپ مومن خاں کی شاعری کے باب میں میری رائے معلوم کرنا چاہتے ہیں۔

غزل گوئی محض ایک رسمی اور غلط چیز ہے۔ مومن کا بڑا کمال یہ ہے کہ اس نے رسمی اور غلط چیز میں ایک بڑی حد تک رنگینی و دل کشی پیدا کر دی تھی۔

علی اختر کے پتے سے مطلع فرمایئے۔ آپ کہیں دہلی بھی آسکیں گے؟

میں یہاں بہت خوش ہوں اور مہربان قدرت کے فیوض سے بہرہ مند۔

نیاز مند

جوش

حیدرآباد میں جوشؔ کی ملازمت اور اخراجِ حیدرآباد سے متعلق دستاویزات[1]

مہاراجا کشن پرشاد کے نام اقبال کا خط

لاہور، ۱۴ جنوری ۱۹۲۴ء

سرکارِ والا تبار تسلیم

نوروز کارڈ کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ میں یکم جنوری سے ۹ جنوری تک لاہور سے باہر تھا۔ نواب صاحبان کرنال (پنجاب) کے مقدمات کی خاطر اتنے روز لاہور سے باہر ٹھہرنا پڑا۔ وہاں سے واپس آیا تو سرکارِ عالی کا نوروز کارڈ پایا جو حقیقت میں نصف ملاقات تھا۔ سرکار اور صاحبزادگانِ والا تبار کی تصویریں نہایت صاف اور ستھری ہیں۔ مصوّر کا فن قابلِ داد ہے۔

یہ خط شبیر حسن صاحب جوشؔ ملیح آبادی لکھنوی کی معرفی کے لیے لکھتا ہوں۔ یہ نوجوان نہایت قابل اور ہونہار شاعر ہیں۔ میں نے ان کی تصانیف کو ہمیشہ دلچسپی سے پڑھا ہے۔ اس خداداد قابلیت کے علاوہ لکھنؤ کے ایک معزز خاندان سے ہیں جو اثر و رسوخ کے ساتھ لٹریری شہرت بھی رکھتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ سرکار ان کے حال پر نظرِ عنایت فرمائیں گے اور اگر ان کو کسی امر میں سرکارِ عالی کے مشورے کی ضرورت ہو گی تو اس سے دریغ نہ فرمائیں گے۔ سرکارِ والا کی شرفا پروری کے اعتماد پر اس درخواست کی جرأت کی گئی ہے۔ امید کہ مزاج بخیر ہو گا۔

مفصل عریضہ انشاء اللہ پھر لکھوں گا۔

مخلص محمد اقبال، لاہور

فقیر کی صدا

قریب ہے کہ ڈبو دے مجھے ہوائے فساد　　سنبھال جلد سفینہ، دکن کی بادِ مُراد
گھِرا ہوا ہوں کچھ اس طرح آفتوں میں کہ ہے　　ہلالِ عید مرے سر پہ تیشۂ فرہاد
مرا ز جوہرِ تکمیل شاعری افسوس　　مرا ز دستِ ہنرہائے خویشتن فریاد
بزرگ تر ز ہنر در زمانہ عیبے نیست　　زمن مپرس کہ ایں عیب بر تو چوں افتاد
دریں زمانہ چو فریاد رس نمی بینم　　مرا رسد کہ رسانم بگوشِ شہ فریاد

اگرچہ قوتِ تخئیل و زورِ فکر سے آج
مرے دماغ پہ قائم ہے شعر کی بنیاد

مگر تباہ ہوں اس حد کا میں کہ نادم ہے
مرے وُجود کی نسبت سے قومِ آدم زاد

مجھے فلک نے دیا ٹھیکرا گدائی کا
کبھی تھے صاحبِ جاہ و حشم مرے اجداد

مگر یہ بات نرالی نہیں ہے دُنیا میں　　ہمیشہ فقر پہ رہتی ہے فَضل کی بُنیاد
پسند ہوتی ہے جب زاغ کی خوش الحانی　　اُسی پہ دام بچھاتا ہے ڈھونڈ کر صیاد
اُبلے رہتے ہیں جن کے دلوں سے چشمۂ نور　　اُنھیں کو رکھتی ہے لبِ تشنہ بخت کی بیداد
جو سر جھکے ہوئے فکرِ سخن میں رہتے ہیں　　انھیں پہ تیغ اُٹھاتا ہے چرخِ کج بنیاد

نگاہِ غور سے تاریخ پر جو کی تو کھُلا
کمالِ فن ہے حسینؑ اور زمانہ ابنِ زیاد

نہ تنگ کرتی جو دُنیا تو اِس گدائی کو
قبول کرتی نہ شاعر کی فطرتِ آزاد

مگر یہ میں نے کہا کیا؟ مری حقیقت کیا
ترے حضور تو خم ہے سرِ غرور تباد

فروغِ شمعِ تبسّم ترا ہر ایک سخن
نسیمِ باغِ ترنّم ترا ہر اِک ارشاد

غُبارِ راہ ترا، غازۂ رُخِ ہستی
نشانِ پا ہے ترا، تاجِ عالمِ ایجاد

ازل میں تجھ کو بنا کر جمالِ مطلق نے
بیاضِ حُسن پہ تیری کیا ہے آنکھ سے صاد

نہیں ہے تیرے برابر جہاں میں کوئی ادیب
نہیں ہے تجھ سا کوئی فنِ شعر میں اُستاد

عطا ہوئی ہے وہ تجھ کو نظر کہ تیری طرح
نہ ہوگا دہر میں باریک بیں کوئی نقّاد

ترے قلم کو ہے جنبش کہ رقصِ بادِ سحر
تری رقم ہے کہ ہے نقشِ مانی و بہزاد

ترے جلال سے محکم ہے سلطنت کا نظام
ترے جمال سے رنگیں ہے گلشنِ ایجاد

تری نگاہ سے تابندہ محفلِ رنداں
تری جبیں سے درخشندہ مجلسِ زہّاد

اگر تو مختلف اجزا کو جوڑنا چاہے
مصالحت کے لیے جمع ہوں ابھی اضداد

خیالِ بادِ بہاری جو آئے دل میں ترے
خزاں کے دور میں چلنے لگے نسیمِ مراد

جو شوق ہو تجھے ویرانیاں ہٹانے کا
تو عاشقوں کے دلوں کی ہوں بستیاں آباد

ترے دکن کی دل آویزیوں پہ قرباں ہے
نسیمِ خاکِ مصلّےٰ و آبِ رکنا باد

بجائے طعنہ اگر تیغ می زند دُشمن
ز شاہ، دست نداریم ہر چہ باد اباد

دلم کہ مخزنِ اسرار بود، دستِ قضا
دُرش بہ بست و کلیدش بہ دستِ عثماں داد

تو تا بروئے من اے شہریار دربستی
دگر جہاں درِ شادی بروئے من نکشاد

ستم ہے تیرے زمانِ عطا و بخشش میں
ہو ایک شاعرِ خوش گو کی زندگی برباد

شکستہ وار بہ درگاہت آمدم کہ طبیب
بمومیائی لطفِ تو اُم نشانی داد

بِلا تھا پھر سے زلیخا کو جس طرح سے شباب — ہوا تھا قید سے جس طرح ماہِ مصر آزاد
اُسی طرح مجھے حاصل ہو مدعا میرا — یوں ہی "برار" کی بابت برائے تیری مراد
خجل نہ ہونے دے مجھ سے مرے کمالوں کو — اِدھر بھی ایک نظر اے امیرِ نیک نہاد
بہا وہ فضل کا دریا جو اپنی رو میں چلے — اُچھالتا ہوا موتی سوئے ملیح آباد

دُعا پہ ختم کر اے جوشؔ اب یہ نظمِ طویل
کہ شہر یارِ دکن کامراں و زندہ باد

(صفحۂ اوّل)

نمونۂ

شوکتِ عثمانی

یعنی

تاریخِ دکن شاہنامہ کے طرز پر

شبیر حسن خاں جوشؔ ملیح آبادی نبیرۂ حسام الدولہ تہور جنگ نواب فقیر محمد خاں گویاؔ

(صفحۂ دوم)

فہرستِ مضامین

تصریحِ مضامین — نمبر — مضمون

۲ ۔ فقیر کی صدا
۳ ۔ عریضہ نگار کی فہرست تصانیف
۴ ۔ عریضہ نگار کی تصانیف کے تنقید نگار
۵ ۔ عریضہ نگار کے متعلق ملک کے مُسلم الثبوت اساتذہ ادب کے خیالات

انشائے تعارف۔ ۶ ۔ عریضہ نگار کی تصنیف رُوحِ ادب کے انگریزی ترجمے اور اس کے مصنف کی شاعرانہ حیثیت کے متعلق حیدرآباد کے یورپین پروفیسروں کی رائے۔

ب ۔ ۱ شوکتِ عثمانی پر حیدرآباد کے اربابِ علم و فضل کی رائیں۔
۲ ۔ مقدمۂ کتاب
۳ ۔ نظمیں

اصل کتاب ۔ گزارشِ احوالِ واقعی
بیداریٔ قلم
نمونۂ رزم ۔ (معرکہ حضور آصف جاہ اوّل و باجے راؤ ۱۱۴۰ھ)
نمونۂ بزم ۔
(ج) نمونۂ واقعہ نگاری۔ (اُفقِ دکن پر شعاعِ اسلام ۹۰ ھ)

تصانیف ۔ رُوحِ ادب کا انگریزی ترجمہ
متعلقاتِ تصانیف۔ عریضہ نگار کی مطبوعہ تصانیف کے نسخے۔

سر اکبر حیدری کا خط نواب امین جنگ کے نام

12·5·24

Personal and Private

My dear Amin Jung,

I am not sure if I have introduced to you Mr Josh Malihabadi. He came to me with a letter from Dr Iqbal and his poems which he recited on the [illegible] dinner was much appreciated. I hope you will kindly give him whatever help you legitimately can.

Au revoir

Yours affly

A. Hydari

عماد الملک کا خط نواب میر عثمان علی خاں کے نام

حضرت بندگانِ عالی متعالی مدظلہ العالی

بہ شرفِ عرض بندگان رفیع الشان رفیع المکان اعلا حضرت خداوند نعمت خدایگان۔ یہ معذور و مجبور قدیم کفش بردارِ خداوند نعمت کا ایک مختصر رسالہ پیش کرنے کی جرأت کرتا ہے۔ اس کے مصنف ایک صاحب شبیر حسین متخلص بہ جوشؔ ہیں۔ جن کا فدوی کی ناقص رائے میں اس وقت ہندوستان میں کوئی ثانی نہیں ہے۔ ان کی شاعری میں خاص خصوصیات ہیں، جس کے ملاحظے میں خاص طور کا لطف ملتا ہے۔ ان کی اور بھی چند تصنیفات ہیں۔ بہت

عمدہ عمدہ جن میں خاص قابلِ ملاحظہ خصوصیات ہیں۔ وہ بھی پیش گاہِ اقدس و اعلا میں پیش کیے جائیں گے، اگر اس رسالہ کو مقبولیت ہوگی۔

زیادہ حدِ ادب

دستخط

کمترین خادمانِ قدیم

عماد الملک

معروضہ ۲۶ر شوال المکرم ۱۳۴۲ھ

(۳۱ر مئی ۱۹۲۴ء)

سر اکبر حیدری کے نام مہاراجا کشن پرشاد کا سفارشی خط

محبِ شاد، شبیر حسن خاں صاحب جوشؔ فرزندِ ارجمند جناب محمد بشیر احمد خاں صاحب بشیر مرحوم و مغفور رئیس ملیح آباد کی پہلی تصنیف (مصوّرِ جذبات) اس فقیر کی نظر سے گزری۔ اس کتاب کا مقدمہ ایک لائق منشی عطار و قلم کا لکھا ہوا ہے جس کا نام نامی رفیع احمد خاں ایم۔ اے ہے۔ بصراحت و فصاحت جوش صاحب کی عالی خاندانی، قابلیتِ ذاتی اور اُن نعمتوں کی تفصیل درج کی ہے جن کو قدرت نے ازل میں اس دُنیائے ناقدر شناس کو پیدا کرنے سے پہلے آپ کی ہستی میں ودیعت کر رکھا تھا۔

کنگ کوٹھی

فرمان

عماد الملک بہادر کی عرضی کے ساتھ شبیر حسن جوش کے دو کتابیں جو گزرانے گئے مرسل ہیں۔ اور اس بارہ میں مسٹر حیدری نے جو خط لکھا ہے ملفوف ہے۔ آخر عرضی گزار کا عندیہ کیا ہے معلوم کیا جائے۔ اور جس سے متعلق ہے کیفیت و رائے عرض کی جائے کہ شبیر حسن کو عثمانیہ یونیورسٹی میں کوئی جگہ مل سکتی ہے یا کیا

۲۸۔ شوال المکرم ۱۳۴۲ھ ۔ دستخط

۲ر جون ۱۹۲۴ء

نواب میر عثمان علی خاں کی خدمت میں جوشؔ کی درخواست

اعلا حضرت، ظلِ سبحانی، حامیٔ دین و ملت، خسرو دارا صولت، عارف نکتہ شناس، حامیٔ ارباب کمال، تاجدار سکندر جلال، حضرت سرکارِ عالی خلد اللہ ملکہٗ و سلطنتہ۔

بہ بارگاہ انجم سپاہ میر ساند

مشرقی تہذیب و شرافت کا معیار مادہ پرست یورپ کے آداب و تہذیب آئینِ تمدن سے ہمیشہ مختلف رہا ہے۔ ایشیائی زبان و قلم سے اپنی ثنا و صفت کا اظہار ایک ایسا فعل مکروہ ہے جو کسی طرح بھی پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا گیا۔

(۱) اور اسی بنا پر عریضہ نگار یہ عرض کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ وہ اپنی ناچیز اور غیر مستند شخصیت کو جامعہ عثمانیہ کی مستقل خدمت کے واسطے کیوں ہر طرح قابلِ انتخاب سمجھتا ہے۔

(۲) اور اسی طرح اس کے وجوہ بھی نہیں بیان کر سکتا کہ تاریخ دکن کو فردوسی کی سی قوتِ بیان کے ساتھ شاہ نامے کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے وہ اپنی ذات کو کن اسبابِ خاص کی بنا پر اس درجہ موزوں تصور کرتا ہے۔

(۳) جامعہ عثمانیہ کی خدمت کے متعلق عجیب نادر خیالات عریضہ نگار کے دل میں تڑپ رہے ہیں۔ اگر قسمت نے مساعدت کی تو وہ اپنے مقدور کے اندر دکھا دے گا کہ ایک ایسے دار العلوم سے جس کی بنیاد خالص زبانِ اُردو پر ہو اور جس کا سنگِ بنیاد دکن کے موجودہ بیدار مغز اور صاحبِ فکر تاجدار نے رکھا ہے۔ کس غیر معمولی لیاقت کے طالب علم برآمد کیے جا سکتے ہیں؟

نیز تاریخِ دکن کے متعلق بھی اُس کے دل میں خاص جذبات موجیں مار رہے ہیں اور صدہا عجیب و غریب روشنیاں اس کے دماغ میں رقص کر رہی ہیں۔ وہ تاریخ

دکن کو صرف نظم کا نادر لباس ہی نہ پہنائے گا، بلکہ اُس کے ساتھ ساتھ اس کے اوراق کو دکن کے موسموں کی رنگین تصاویر، دکن کی قابلِ ذکر ہستیوں کے فوٹو، دکن کے قدیم وجدید رسم و رواج اور عمارات کے نقشوں سے اس طرح آراستہ و پیراستہ کر دینے کی تمنا رکھتا ہے کہ زمانے کا کوئی انقلاب، حوادث کی کوئی زبردست بارش اُس کے ایک نقش کو بھی دُھندھلا نہ کر سکے۔

اس کے علاوہ یہ خادم دکن کا ماضی و مستقبل، دکن کے کارنامے اور خدمات، دکن کی جائے وقوع اور دکن کی سیاسی اہمیت پر بھی اِس طرح روشنی ڈالنا چاہتا ہے کہ ادبی لطافتوں کے دوش بدوش یہ مجموعہ ایک انتہائی کارآمد اور مفید "تصنیف" کا خطاب بھی حاصل کر سکے۔

(۴) جامعہ عثمانیہ اور تاریخ دکن اِن دونوں کی خدمت کا ولولہ تو اس ناچیز عریضہ نگار کے دل میں ضرور ہے لیکن اِن چیزوں کے واسطے اپنی اہلیت ثابت کرنے کے لیے اُس کے مُنہ میں زبان نہیں ہے۔ ہر چند اس کا جی چاہتا ہے کہ وہ نقادِ فن تاجدار کی بارگاہ میں اپنی خصوصیات کے متعلق کچھ عرض کرے مگر انکسار کے نازک جذبات کو ٹھیس لگتے دیکھ کر اُس کی زبان دہن میں اِس طرح جنبش کر کے رہ جاتی ہے جس طرح نسیم سحر کی نرم رَو میں گلاب کی پنکھڑی یا جذبات کی کشاکش اور کلام کے ذوق میں گونگے کے لب۔

(۵) غریب شاعر ایوانِ شاہی میں داخل ہوتا ہے۔ سر جُھکائے، مُودّب اور خاموش اُس کے ایک ہاتھ میں اُس کی ناچیز تصانیف کے نسخے ہیں۔ معہ اُن تنقیدوں کے جنھیں مُلک کے مُسلم الثبوت ارکانِ علم و ادب نے اس کے مزخرفات کے متعلق لکھا ہے ــــ اور دوسرے ہاتھ میں وہ قلم برداشتہ (رزمیہ، بزمیہ) نظمیں ہیں، جنھیں تاریخِ دکن کے موضوع پر اُس نے بطور نمونہ پیش گاہِ اقدس میں گزراننے کے لیے اِس مختصر قیام حیدر آباد کے اثنا میں تحریر کیا ہے۔

اور یہ دونوں نتائجِ افکار جوہر شناس نظر میں خود فیصلہ کر دیں گے کہ اُن کا پیش کرنے والا اپنے میں اُن دونوں خدمتوں کے انجام دینے کی کس حد تک اہلیت رکھتا ہے۔

بارگاہِ خسروی کا جلال شکستہ دل شاعر کی رگ رگ پر چھایا ہوا ہے۔ آنکھیں جھکی ہوئی ہیں اور دل دھڑک رہا ہے، لیکن اس کی مطالعہ فطرت کرنے والی آنکھیں تاجدارِ دکن کی نکتہ شناس نگاہوں کی طرف ایک عجیب اُمید و بیم کے ساتھ اُٹھی ہوئی ہیں۔ ؎

جوہرے دارم و صاحب نظرے می جویم

گذارندہ

خاکسار شبیر حسن جوش ملیح آبادی

کنگ کوٹھی

فرمان

ملاحظہ :- عرضداشت صیغۂ عدالت معروضہ ۱۰ ربیع الثانی سنہ ۱۳۴۳ھ جو شبیر حسن جوش ملیح آبادی اور ترجمہ معاشیات کی نسبت ہے۔

حکم :- جوش ملیح آبادی کو انگلش لٹریچر کی کتب کا ترجمہ کرنے کیلئے امتحاناً دو سال کیلئے ذاتی سو روپیہ ماہوار کی جگہ دیجائے۔ مگر پہلے اون سے استمزاج کیا جائے کہ آیا وہ اس کو منظور کرتے ہیں یا نہیں۔ اور اون سے یہ بھی کہدیا جائے کہ اگر یہ اونکو منظور نہیں ہے تو اس سے زیادہ اونکے حق میں کچھ نہیں ہو سکتا۔ کارروائی داخل دفتر کردی جائے گی۔

چونکہ معاشیات کے ترجمہ کے متعلق تقرر طلب ہے اور یہ کسی دوسرے اہل شخص کا تقرر عمل میں آنا چاہئے بعوض کیفیات کے۔ دو تین نام پیش کر کے منظوری حاصل کی جائے۔

۲۰ جمادی الاول سنہ ۱۳۴۳ھ

(۲۵ دسمبر ۱۹۲۴ء)

میر عثمان علی خاں کے نام جوش کا معافی نامہ

بندگانِ عالی متعالی مدظلہ العالی خلد اللہ ملکہ و سلطانہ

بپیش گاہ اقدس ارفع منزلت اعلیٰ حضرت سلطان العلوم ظل سبحانی خلیفۃ الرحمانی

۱۵ اکتوبر ۱۹۳۳ء

بعز سمع ہمایوں
میرساند

جہاں پناہا۔ اس عالم میں جب کہ عالمِ اسلام پر نکبت و ادبار کے بادل چھائے ہوئے ہیں اور ظل اللہ کے علاوہ درماندہ مسلمانوں کا کوئی پوچھنے والا باقی نہیں رہا ہے اور اس ماحول میں کہ دہلی کی سلطنت کا چراغ گُل ہو جانے کے بعد اب صرف دکن ہی تمام ہندوستان کو منوّر کیے ہوئے ہے۔ نیز اس زمانۂ تنزل میں کہ مسلمانوں کے واسطے کوئی جائے پناہ باقی نہیں ہے۔ اعلیٰ حضرت بندگان عالی کا پرچم اپنے سائے میں مسلمانوں کو جمع کیے ہوئے ہے اور ظل اللہ کے سایۂ رحمت میں اس وقت کائنات کے سب سے زبردست اور جلیل القدر پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اُمّت اطمینان کے ساتھ سانس لے رہی ہے۔ یہ کیوں کر ممکن ہے کہ کوئی مسلمان خواہ وہ اس سلطنت ابد مدت کا نمک خوار ہو یا نہ ہو۔ حضور بندگانِ عالی کی بارگاہِ عظمت و جلال میں سوءِ ادب کا خواب

بھی دیکھ سکے۔

اس کے علاوہ فدوی کو وہ زمانہ یاد ہے اور ہمیشہ یاد رہے گا جب اُس پر عرصۂ حیات تنگ تھا اور زمین اُسے جگہ نہیں دے رہی تھی۔ عین اُس لمحۂ ہلاکت میں بندگانِ عالی نے بکمالِ رحمت خسروانہ فدوی کے سر پہ ہاتھ رکھا اور اس کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو بھنور کے منھ سے نکال لیا۔

فدوی ایک شریف خاندان کا رُکن ہے۔ شریف اپنے محسنوں پہ جان نثار کر دیا کرتے ہیں۔ یہ کیوں کر ممکن ہے کہ فدوی اپنے اتنے بڑے عظیم المرتبت محسنِ اعظم کی شان میں سوء ادب کا تصور بھی اپنے ذہن میں لاتا جو محسن ہونے کے علاوہ اس کی قوم کا واحد تاجدار بھی ہے۔ آقائے ولی نعمت! حقیقت حال یہ ہے کہ "صبح دکن" کے سالگرہ نمبر کے واسطے مدیر "صبح دکن" فدوی سے ایک تہنیتی نظم لکھا چکے تھے۔ اس کے بعد مدیر نظام گزٹ و "منشور" نے اصرار شروع کیا۔ لیکن اس اثنا میں فدوی سخت بیمار پڑ گیا۔ یہ بیماری اس درجہ شدید تھی جس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ فدوی اس مرتبہ سال گرۂ ہمایونی کے ڈنر میں شریک ہونے کی عزت و سعادت بھی حاصل نہ کر سکا۔ اسی حالت میں مدیر منشور کے تقاضوں سے شرماکر میں بخار کی کیفیت میں اپنی ایک پُر بہار غزل انھیں دے دی جس میں محض اپنی ذات سے تخاطب ہے جیسا کہ اکثر شعرا کیا کرتے ہیں۔

پروردگارِ عالم جو دلوں کے بھید جانتا ہے، بخوبی واقف ہے کہ یہ محض ایک بہاریہ غزل ہے جس میں فدوی نے اپنی ہی ذات سے خطاب کیا ہے۔ فدوی کی یہ مجال ہے کہ حضورِ اقدس و اعلیٰ سے مخاطب ہو کر یہ عرض کرے کہ "کبھی جوشؔ کے جوشش کی مدح فرما"۔

فدوی نے حضرت اقدس و اعلیٰ کی مدح میں اسی سالگرہ مبارک کی تقریب میں اور کچھ پہلے موکب ہمایونی کے دہلی نہضت فرمائی کے موقع پر اخبار (الجمعیۃ دہلی کے واسطے) دو نظمیں عرض کی تھیں جو منسلک ہیں۔ ان سے پتا چلے گا کہ خادم نے جب بادشاہِ وقت کے متعلق کچھ لکھا ہے اُس کا لب و لہجہ کس قدر مودبانہ رہا ہے۔ پھر بھی فدوی کو بے پایاں پشیمانی اور عدل کے ساتھ اپنی اس غلطی کا اعتراف ہے کہ اُس نے اس غزل پر

"بہ تقریبِ سالگرہ" کی سُرخی کیوں قائم کردی۔

فدوی کو اپنی اس غلطی کا جو بخار کی شدّت کے باعث سرزد ہوئی ہے اعتراف ہے۔ بہ کمالِ ادب معافی کا خواستگار ہے۔ اگر بہ مراحمِ خسروانہ حضورِ اقدس و اعلیٰ عفو و درگزر سے کام لیں تو ذاتِ ہمایونی کی ذرّہ نوازی سے بعید نہیں ہے۔ زیادہ حدِ ادب۔

معروضہ ادب •

۲۷ رجب المرجب ۱۳۵۲ھ فدوی شبیر حسن خاں جوش

فدوی دستخط (شبیر حسن خاں جوش)

اعلیٰحضرت بندگانعالی متعالی مدظلہ العالی

H. E. H. THE NIZAM'S PESHI OFFICE.
KING KOTHI,
HYDERABAD-DECCAN.

مورخہ ۱۶ - رجب المرجب ۱۳۵۲ھ

بخدمت شریف جناب مولوی سید محمد سعید صاحب معتمد باب حکومت سرکارِ عالی

اخبار منشور میں جوش ملیح آبادی نے جو نظم لکھی ہے اوسکے نسبت آپ کو تحریر کرنے کیلئے سرکار کا جو حکم ہوا ہے وہ حسب ذیل ہے :-

"مہاراجہ بمبئی سے آنے بعد جوش ملیح آبادی سے جواب لیا جائے کہ انہوں نے اخبار منشور کے سالگرہ نمبر میں جو نظم لکھی ہے جسکا عنوان نعرۂ جشن قرار دیا ہے اسکے مقطع میں جو الفاظ لکھے گئے ہیں وہ سراسر بے ہیں کی گو، ادبی پر محمول ہوتے ہیں پس اونکو چاہئے کہ آئندہ سے ایسے حرکات سے باز رہیں ورنہ اون سے سخت بازپرس کی جائیگی جس صورت میں کہ باردیگر ایسی غلطی ہوگی وبس۔"

معتمد پیشی

(۳ نومبر ۱۹۳۳ء)

فرمان

بلاحظہ:- عرضداشت صیغۂ تعلیمات معروضہ ۱۸ شعبان المعظم سنہ ۱۳۵۲ھ آجکے ساتھ جوش ملیح آبادی کا جواب گزرانا گیا ہے اوس نظم کے نسبت جو انہوں نے اخبار منشور کے سالگرہ نمبر میں لکھی تھی۔

حکم:- اس نے اپنی دیدہ و دانستہ گستاخی کو جو ایک عذر لنگ کے ساتھ پیش کیا ہے وہ ہرگز اس قابل نہیں ہے کہ اس سے درگذر کیا جائے تاہم میں اس شرط کے ساتھ اسکو معافی دیتا ہوں کہ آئندہ اگر پھر اس سے ایسی غلطی سرزد ہوگی تو ۲۴ گھنٹے کے اندر اسکو خدمت سے علحدہ کر دیا جائے گا کیونکہ مجھے معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ اسکی پرائیویٹ لائف ہرگز اطمینان کے قابل نہیں ہے اور ایسے کیرکٹر کے اشخاص کو سرکاری محکمہ میں جگہ دینا گویا محکمہ کی تذلیل کرنا ہے وبس۔ یہی جواب اوسکو بتوسط صیغۂ متعلقہ دیکر کارروائی داخل دفتر کردی جائے۔

۱۸ شعبان المعظم سنہ ۱۳۵۲ھ

(۵ دسمبر ۱۹۳۳ء)

نواب مہدی یار جنگ کے نام نواب صاحب کا فرمان

اعلیحضرت بندگانعالی متعالی مدظلہ العالی

H. E. H. THE NIZAM'S PESHI OFFICE,
KING KOTHI,
HYDERABAD-DECCAN

مورخہ ۲ - جمادی الاول ۱۳۵۳ھ

بخدمت شریف جناب مولوی سید محمد مہدی صاحب معتمد باب حکومت سرکار عالی

عثمانیہ یونیورسٹی کے دار الترجمہ کے ملازم شبیر حسین خان جوش ملیح آبادی کے متعلق آپ کو تحریر کرنے کیلئے سرکار کا جو حکم ہوا ہے وہ حسب ذیل ہے:-

"اس شخص کو اگرچہ پیشتر متنبہ کیا گیا تھا کہ وہ اپنے اعمال کو درست کرے ورنہ اسکی علحدگی عمل میں آئیگی مگر افسوس ہے کہ اسکا کچھ نتیجہ اچھا نہیں نکلا بلکہ سابقہ حالات اسکے جہاں تک ابھی باقی ہیں لہذا مناسب ہوگا کہ جس مدت کیلئے وہ یہاں ملازم تھا اوس حساب سے کچھ ماہوار بطور رعایت اسکے نام جاری کرکے (جسکی مقدار سے پہلے یہاں اطلاع دی جائے) اسکو کہدیا جائے کہ وہ دو ہفتہ میں یہاں سے خاموشی سے وطن چلا جائے اور بغیر اجازت پھر یہاں آنے کا قصد نہ کرے"

حسب الحکم

[illegible]

(۱۳، اگست ۱۹۳۴ء)

نواب مہدی یار جنگ کے نام نواب صاحب کا فرمان

H. E. H. The Nizam's Peshi Office.
King Kothi.
Hyderabad-Deccan.

مورخہ ۱۷ - جمادی الاول سنہ ۱۳۵۳ھ
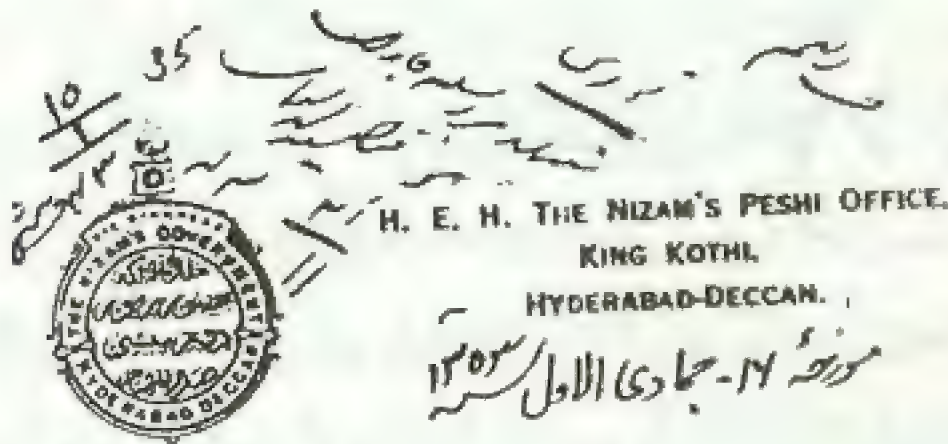
بخدمت شریف جناب مولوی سید محمد مہدی صاحب معتمد باب حکومت

جوش ملیح آبادی کی نسبت آپ کو تحریر کرنے کیلئے سرکار کا جو حکم ہوا ہے وہ حسب ذیل ہے:—

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ جوش ملیح آبادی کل یوم سہ شنبہ یہاں سے اپنا وطن چلے جا رہا ہے (جسکو حال میں خدمت سے وظیفہ پر علحدہ کیا گیا تھا) پس اسکو بتوسط صیغۂ متعلقہ حکم سنایا جائے کہ جو کچھ وظیفہ (از روئے سروس) اسکو ملیگا تو وہ اس شرط پر کہ وہ بیرون ممالک محروسہ سرکار عالی خاموشی سے زندگی بسر کرے یعنی وہاں جاکر اگر یہ پھر اپنے خبث باطن کا اظہار کریگا (جیسا کہ اسکی عادت رہی ہے) تو بعد تصدیق یہ وظیفہ بھی یادداشت مسدود ہو جائیگا ونس"

معتمد پیشی

(۲۷ اگست ۱۹۳۴ء)

نواب حیدرآباد کا فرمان

"کونسل کی رائے کے مطابق شبیر حسین جوشؔ کے نام (ماعہ) روپیہ کلدار وظیفہ جاری کیا جائے، مگر اس شرط کے ساتھ کہ وہ پھر کسی قسم کی نازیبا حرکت کرے گا تو یہ بعد ثبوت مسدود ہو جائے گا۔ انھوں نے خریدی موٹر کار اور تعمیر مکان کے لیے جو قرضہ حاصل کیا تھا اس کے معاوضہ میں جو موٹر کار اور مکان وغیرہ مکفول ہیں ان پر منجانب سرکار قبضہ کر لیا جائے۔ اس کے بعد اگر کوئی قرضہ باقی رہے تو اُن کے وظیفہ سے بحساب فی ماہ دعہ ۲۵ حاصل کر لیا جائے۔"

(۲۳ جنوری ۱۹۳۵ء)

نواب مہدی یار جنگ

7, SIKRI BHAWAN,
96, WALLESHWAR ROAD,
BOMBAY-6

غالباً ۱۷ر نومبر ۱۹۴۷ء

مکرّمی!

اِس سے قبل بھی متعدد بار عرض کر چکا ہوں، اور آج بھی اِس خط کے ذریعے سے عرض کر رہا ہوں کہ حیدر آباد میں میرے داخلے کے امتناع کو، براہِ کرم، اجازت میں تبدیل کرا کے مجھے اس کا موقع دیجیے کہ وہاں کی اُن گلیوں میں پھر ایک بارگشت کر لوں، جہاں میں نے اپنی جوانی کے بہترین ایام صَرف کیے اور اُن دوستوں سے زندگی کے اِن آخری لمحوں میں، پھر ایک بار مل کر دل ٹھنڈا کر لوں جو خوابوں میں میرا تعاقب کیا کرتے ہیں۔

کافر ہوں جو اِن دو مندرجہ بالا باتوں کے علاوہ اور کوئی تمنّا رکھتا ہوں۔ ذرا سی بات ہے، آپ تحریک کر دیں تو بڑی آسانی سے اُس حکم کی تنسیخ ہو سکتی ہے، جس نے حیدر آباد کو میرے واسطے "شجرِ ممنوع" بنا رکھا ہے۔

خدا کرے، آپ بہمہ وجوہ مع الخیر ہوں، اور یہ خط آپ کو ایسے موڈ میں ملے کہ اسی وقت آپ میرے حسبِ مُراد کارروائی کا آغاز فرما دیں۔

آپ کا از یادِ رفتہ نیاز مند
جوشؔ

نواب حیدر آباد کا فرمان

زمانہ پُر آشوب ہے اور اس شخص کا رویہ زمانہ گذشتہ میں کیا تھا وہ بھی روشن ہے۔ لہذا سابقہ حکم پر نظر ثانی نہیں ہو سکتی یعنی اس کو ممالک محروسہ میں آنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔

(۲۴ جنوری ۱۹۴۴ء)

معتمد حکومتِ حیدر آباد دکن

8, OLD AGHA KHAN BUILDING,
JACOB CIRCLE,
BOMBAY

۳۱ دسمبر ۱۹۴۷ء

بجواب مراسلہ ۲۷ بہمن ۱۳۵۷ ف (نشانِ مجاریہ ۱۷۳۱)
بخدمت مددگار معتمد صاحب بابِ حکومت سرکارِ عالی۔

مراسلہ پہنچا۔ معلوم ہوا کہ "فرمانِ خسروی" کی روشنی میں دفترِ ہذا مزید کارروائی کرنے سے قاصر ہے۔ چلیے بہت اچھا ہوا۔ انقلاب سے بیشتر حیدر آباد کی سیر میں لطف بھی نہ آتا۔

پیچ و تاب اِس قدر اے موج عبث ہے تجھکو
رول دیوے گا نہ موتی مجھے دریا تیرا

جوشؔ

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگرد انیم
قضا ز جنبشِ رطلِ گراں بگرد انیم

مکتوب الیہم

عبدالماجد دریا بادی :۔ مولانا کے والد مولوی عبدالقادر لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ مختلف عہدوں سے ترقی کر کے ڈپٹی کلکٹر ہو گئے تھے۔ ان کا تعلق قدوائی خاندان سے تھا۔ مولانا عبدالماجد دریا آبادی ۱۶ مارچ ۱۸۹۲ء کو پیدا ہوئے۔ فارسی اور عربی کی تعلیم گھر پر ہوئی۔ ۱۸۹۹ء میں والد کے ساتھ سیتاپور آ گئے اور یہیں پرائمری سے دسویں تک کی تعلیم حاصل کی۔ لکھنؤ کے کیننگ کالج سے ۱۹۱۲ء میں بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ تھوڑے عرصے کے لیے پہلے مولانا شبلی کے ساتھ ملازمت کی، پھر محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں لٹریری اسسٹنٹ ہوئے۔ اس کے بعد دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی کے ایک رکن کی حیثیت سے کام کیا۔ اس کے بعد کہیں ملازمت نہیں کی۔ اوائل ۱۹۱۹ء میں نظام حیدر آباد نے ایک سو پچیس روپے ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا۔ ۱۹۴۶ء میں یہ وظیفہ دو سو روپے کر دیا گیا۔ لیکن سقوطِ حیدر آباد کے بعد یہ ماہانہ ایک سو پچیس روپے رہ گیا۔

اُردو اور انگریزی میں اڑسٹھ تصنیفات، تالیفات اور تراجم یادگار چھوڑے۔ مولانا نے جن موضوعات پر کتابیں اور مضامین لکھے ہیں وہ ہیں تنقید، مذہب، سوانح، فلسفہ، نفسیات، سفر نامہ اور تراجم۔

۶ جنوری ۱۹۷۷ء کو لکھنؤ میں انتقال ہوا۔

(ملاحظہ ہوں: آپ بیتی، مصنفہ مولانا عبدالماجد۔ عبدالماجد: احوال و آثار۔ عبدالماجد: حیات و خدمات)

شیخ منظور الٰہی: بقول مشفق خواجہ شیخ صاحب پاکستان سول سروس سے متعلق تھے۔ پاکستان میں کئی اعلا عہدوں پر فائز رہے۔ ۱۹۹۳ء میں عبوری حکومت کے دوران پنجاب کے وزیر اعلا رہے۔ "درِ دل کشا" اور "سلسلۂ روز و شب" کے مصنّف ہیں۔ (بہ شکریہ مشفق خواجہ صاحب)

سجّاد ظہیر، سید :۔ سید وزیر حسن کے صاحب زادے تھے۔ لکھنؤ میں ۵ نومبر ۱۹۰۵ء کو پیدا ہوئے۔ لکھنؤ ہی میں ابتدائی سے لے کر بی۔اے تک کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۳۵ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی (لندن) سے بی۔اے (آنرز) اور بار ایٹ لا کے امتحانات پاس کیے۔ ۱۰ دسمبر ۱۹۳۸ء کو ان کی شادی رضیہ سجاد ظہیر سے ہوئی۔ سجاد ظہیر کمیونسٹ پارٹی کے ممبر تھے۔ جن لوگوں نے لندن میں ہندوستانی ترقی پسند ادیبوں کی انجمن قائم کی تھی، ان میں سجاد ظہیر پیش پیش تھے۔ مرحوم طویل عرصہ تک ترقی پسند مصنفوں کے سربراہ رہے۔ ۱۹۴۰ء میں بغاوت کے الزام میں گرفتار ہوئے۔ تقریباً دو سال تک جیل میں رہے۔ ۱۹۴۸ء میں کمیونسٹ پارٹی نے پاکستانی کمیونسٹ پارٹی کی نظامت کے لیے انھیں پاکستان بھیجا۔ ۱۹۵۱ء میں راولپنڈی سازش کیس کے سلسلے میں گرفتار ہو گئے اور چار سال کی سزا ہوئی۔ لیکن مدت ختم ہونے سے پہلے رہا کر دیئے گئے۔ ۱۹۵۵ء میں پھر ہندوستان واپس آ گئے۔ ۱۳ ستمبر ۱۹۷۳ کو الماتا (سوویت روس) میں ان کا انتقال ہو گیا۔

اختر حسین :۔ آئی۔سی۔ایس تھے۔ بعد میں سی۔ایس۔پی ہو گئے۔ مرکزی حکومت میں وزیرِ تعلیم رہے۔ جب پاکستان کے چاروں صوبے "مغربی پاکستان" کہلاتے تھے۔ اس وقت اختر صاحب مغربی پاکستان کے گورنر تھے۔ مولوی عبدالحق کی وفات کے بعد ۱۹۶۱ء میں انجمن ترقی اُردو کے صدر منتخب ہوئے اور وفات تک اس عہدے پر فائز رہے۔ تقریباً ۸۱ برس کی عمر میں ۱۵ جولائی ۱۹۸۳ء کو کراچی میں وفات پائی۔ اُن کی آپ بیتی شائع ہو چکی ہے۔ (بہ شکریہ مشفق خواجہ صاحب)

مشفق خواجہ :۔ خواجہ صاحب کشمیری النسل ہیں۔ اُن کے آباؤ اجداد کشمیر سے لاہور آئے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ والد کا نام خواجہ عبدالوحید تھا عبدالوحید صاحب کو اُردو، فارسی، عربی اور انگریزی پر بہت قدرت حاصل تھی۔ اسلامیات کے مختلف موضوعات پر انھوں نے خاصی تعداد میں کتابیں لکھی ہیں۔ ۱۹۷۹ء میں خواجہ عبدالوحید کا انتقال ہو گیا۔ مشفق خواجہ کا اصل نام خواجہ عبدالحئی ہے۔ ۱۹ دسمبر ۱۹۳۵ء

کو لاہور میں ولادت ہوئی۔ ۱۹۵۸ء میں کراچی یونیورسٹی سے اُردو میں ایم۔اے کیا۔ ۱۹۶۴ء میں اُن کی شادی آمنہ صاحبہ سے ہوئی۔ آمنہ صاحبہ کراچی کے ایک کالج میں لیکچرر ہیں اور خود بھی ادیب ہیں۔ اُن کی کتاب "افکارِ عبدالحق" کے اب تک کئی اڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ ۱۹۵۷ء میں خواجہ صاحب انجمن ترقی اُردو (پاکستان) میں ملازم ہو گئے۔ ۱۹۷۳ء میں مستعفی ہو گئے۔ تب سے کہیں ملازمت نہیں کی۔ علمی و ادبی کاموں میں مصروف ہیں۔ خواجہ صاحب کے مزاحیہ کالم بے مثال ہیں۔ اُن کا ہر کالم ہندوستان اور پاکستان کے متعدد رسالوں میں نقل ہوتا ہے۔ انھوں نے سعادت خاں ناصر کا تذکرہ "خوش معرکۂ زیبا" مرتب کیا۔ اُن کی تالیفات اور تصنیفات میں "جائزہ مخطوطات اُردو"، "غالب اور صفیر بلگرامی" خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ اُن کی شاعری کا مجموعہ "ابیات" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔
(خلیق انجم۔ مُرتّب، مشفق خواجہ۔ ایک مطالعہ، (کتاب نما کا خاص نمبر) نئی دلّی ۱۹۸۵ء)

ظفر ادیب :۔ اصل نام بھیم سین تھا۔ ملتان چھاؤنی (پاکستان) میں ۱۳ جنوری ۱۹۱۳ء کو پیدا ہوئے۔ بہت دولت مند خاندان سے تھے۔ تقسیم کے بعد ہندوستان آگئے۔ پورا سرمایہ پاکستان چھوڑ آئے تھے، اس لیے ہندوستان میں پنپ نہیں سکے۔ بہت غربت میں زندگی گزاری۔ ۳۰ جون ۱۹۸۴ء کو انتقال ہو گیا۔

جدّن بائی : بہت مشہور موسیقار اور ممتاز اداکارہ نرگس کی والدہ تھیں۔

جمیل مظہری :۔ تاریخی نام میر کاظم علی تھا۔ ستمبر ۱۹۰۴ء میں پٹنے (بہار) کے محلّہ مغلپورے میں ولادت ہوئی۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ سلیمانیہ پٹنہ میں ہوئی۔ ۱۹۲۳ء میں میٹرک اور ۱۹۳۱ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے فارسی میں ایم۔اے کیا۔ روزنامہ "الہند" کے اڈیٹر مقرر ہوئے۔ ۱۹۳۳ء میں "عصرِ جدید"، کلکتہ سے وابستہ ہو گئے۔ ۱۹۳۷ء میں مولانا ابوالکلام آزاد کی سفارش پر حکومتِ بہار کے پبلسٹی افسر مقرر ہوئے۔ "ہندوستان چھوڑو" تحریک میں ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ ۱۹۴۳ء میں بمبئی آکر مکالمہ نویس اور گیت نگار ہو گئے۔ ۱۹۶۰ء میں پٹنہ یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو میں لیکچرر ہو گئے۔ اُردو کے ممتاز اور مشہور شاعر تھے۔ ۲۳ جولائی ۱۹۷۹ء کو بھیکن پور (بہار) میں وفات پائی۔ (جمیل مظہری کے مرثیے: ۲۴۷۔ ۳۵۲)

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر:۔ گورو نانک جی کی نسل سے اور بابا ہردت سنگھ بیدی کے صاحبزادے تھے۔ ۹ مارچ ۱۹۰۹ء کو منٹگمری میں پیدا ہوئے۔ اُن کے چار بھائی تھے۔ ابتدائی تعلیم گورنمنٹ کالج منٹگمری میں پائی۔ بعد کی تعلیم چیفس کالج لاہور اور گورنمنٹ کالج لاہور میں حاصل کی۔ ۱۹۳۵ء میں روہتک میں مجسٹریٹ درجہ اوّل مقرر ہوئے۔ اس کے بعد لائل پور، جالندھر، ملتان، کانگڑہ، جہلم، روہتک، دلّی، سونی پت، کوروکیشتر، گوڑگاؤں، چنڈی گڑھ، سنگرور، کرنال وغیرہ میں مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ ۱۹۶۷ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ اچھے شاعر تھے اور مشاعروں کی جان تھے۔ بہت سی علمی، ادبی اداروں کے علاوہ کشتی، باکسنگ، شطرنج، پتنگ بازی وغیرہ کی انجمنوں سے منسلک تھے۔ ۱۷ جولائی ۱۹۹۲ء کو دہلی میں کینسر کے مرض سے انتقال ہوا۔
(ہمارے کنور صاحب، ۱۳ - ۱۹)

شنکر پرشاد:۔ ذات کے سکسینہ تھے۔ والد کا نام لالہ کامیشوری تھا۔ شنکر پرشاد ۱۰ مارچ ۱۹۰۵ء کو اپنے آبائی وطن بریلی میں پیدا ہوئے۔ بارہ سال تک گھر پر تعلیم حاصل کی۔ ابھی کم سن ہی تھے کہ والدہ کا انتقال ہو گیا۔ والد نے دوسری شادی کر لی، جس کے بعد ان کے دادا نے ان کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری قبول کر لی۔ دادا کے انتقال کے وقت ان کے والد سیتا پور میں تھے۔ چناں چہ یہ بھی سیتا پور چلے گئے۔ وہاں سے ۱۹۲۱ء میں میٹرک کیا اور اعلا تعلیم حاصل کی۔ جنوری ۱۹۲۸ء میں آئی۔ سی۔ ایس کے امتحان میں کامیابی حاصل کی اور تربیت کے لیے انگلینڈ بھیج دیے گئے۔ ۱۹۳۰ء میں واپس آئے۔ گونڈہ اور امروہہ کے جوائنٹ مجسٹریٹ کے طور پر ان کا تقرر ہوا۔ ۲۲ جولائی ۱۹۴۸ء کو دہلی کے چیف کمشنر مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۴ء تک اس عہدے پر فائز رہے۔ ۱۹۵۴ء میں دہلی میں جب پہلی اسمبلی بنی تو دہلی کے لیفٹننٹ گورنر بنے۔ اس عہدے کے بعد چار سال کے لیے انڈین ایئر لائنز کارپوریشن کے چیئرمین اور پھر تقریباً آٹھ سال کے لیے امورِ کشمیر کے اسپیشل سکریٹری رہے۔ ۱۹۶۵ء سے ۱۹۶۶ء تک آسام ہل ایریا کمیٹی کے ممبر رہ کر ریٹائر ہو گئے۔ ۲۴ جولائی ۱۹۹۰ء کو دہلی میں ان کا انتقال ہو گیا۔
(بہ شکریہ بیگم ممتاز مرزا مرحوم)

ساحؔر ہوشیار پوری، رام پرکاش :- ۱۰ فروری ۱۹۱۳ء کو پنجاب (پاکستان) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مُکھی رام کپڑے کے تاجر تھے اور رؤسا میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ ساحر ہوشیار پوری نے ۱۹۳۳ء میں گورنمنٹ کالج (لاہور) سے فارسی میں بی۔ اے آنرز، اور ۱۹۳۵ء میں ایم۔ اے (فارسی) کی ڈگری حاصل کی۔ ایک برس تک شہزادگانِ پٹیالہ کے اتالیق رہے اور ۱۹۳۷ء میں اپنے آبائی کاروبار میں مصروف ہو گئے۔ ۱۹۴۷ء میں ہندوستان آگئے اور مختلف شہروں میں ہوتے ہوئے ۱۹۵۰ء میں دہلی میں سکونت اختیار کر لی۔ ۱۹۸۱ء میں فرید آباد (ہریانہ) میں منتقل ہو گئے۔ ۱۹۴۹ء میں کانپور سے ماہنامہ "چندن" جاری کیا۔ لیکن وہ ایک سال سے زیادہ نہیں چل سکا۔ ۱۹۶۷ء میں دہلی سے ماہنامہ "ماہِ نو" جاری کیا، اس کی عمر بھی ایک سال سے زیادہ نہیں ہو سکی۔ ساحؔر ہوشیار پوری اُردو کے مشہور شاعروں میں تھے۔ وہ جوؔش ملسیانی کے شاگرد تھے اور جوؔش ملیح آبادی سے ان کے قریبی تعلقات تھے۔ ان کے چھ سات مجموعۂ کلام شائع ہوئے ہیں۔ مختلف اکیڈمیوں نے ان کو کئی انعامات سے نوازا۔ ۱۲ اگست ۱۹۹۴ء کو ساحر ہوشیار پوری کا فرید آباد (ہریانہ) میں انتقال ہو گیا۔ (نقوشِ داغ: ۲۲۳-۲۲۴۔ یادوں کا جشن: ۲۷۳-۲۷۶۔ کچھ معلومات جناب سید مرتضیٰ حسین بلگرامی نے فراہم کیں۔)

جمیل جالبی :- اصل نام محمد جمیل خاں ہے۔ یکم جولائی ۱۹۲۹ء کو سہارنپور (ہندوستان) میں پیدا ہوئے۔ جالبی صاحب کے والد محمد ابراہیم نے خان صاحب کو مذہبی تعلیم دی تھی۔ پیشے کے اعتبار سے زمین دار تھے۔ تقسیم ہند کے بعد جمیل صاحب پاکستان چلے گئے۔ جمیل صاحب نے پہلے انگریزی اور پھر اردو میں ایم۔ اے اور ایل۔ ایل۔ بی کے امتحانات پاس کیے۔ کچھ عرصے بعد پی۔ ایچ۔ ڈی اور ڈی لٹ کی ڈگریاں حاصل کیں۔ مختلف سرکاری ملازمتوں کے بعد کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور مقتدرہ "قومی زبان"، اسلام آباد کے صدر نشیں رہے۔ بیس پچیس کتابوں کے مصنف، مرتب اور مترجم ہیں۔ تین جلدوں میں "تاریخ ادبِ اردو" اور دو جلدوں میں "انگریزی اُردو لغت" اُن کے تاریخی ادبی کارنامے ہیں۔ (ڈاکٹر جمیل جالبی: ایک مطالعہ)

میکش اکبر آبادی :۔ ۳ مارچ ۱۹۰۲ء کو میوہ کٹرا آگرے میں اپنے آبائی مکان میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام سید اصغر علی شاہ تھا۔ میکش کی عمر ابھی تقریباً پونے دو سال کی تھی کہ اُن کے والد کا انتقال ہوگیا۔ میکش کی تعلیم مدرسۂ عالیہ آگرہ میں ہوئی، جہاں سے اٹھارہ سال کی عمر میں انھوں نے درسِ نظامی کی تکمیل کی سند حاصل کی۔ چوں کہ میکش کے جدِ سوم امجد علی شاہ صاحب اصغر اپنے زمانے کے بہت مشہور صوفی تھے۔ شاید اس لیے میکش کا مزاج بھی صوفیانہ تھا۔ انھوں نے تصوّف کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اُردو کے ممتاز شاعر تھے۔ نظم و نثر میں آٹھ دس کتابوں کے مصنف تھے۔ ۲۵ اپریل ۱۹۹۱ء کو فالج کے مرض میں وفات پائی۔

اعجاز صدّیقی :۔ اصل نام اعجاز حسین تھا۔ علّامہ سیماب اکبر آبادی کے صاحبزادے تھے۔ ۱۹۱۱ء میں آگرے میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۲۴ء میں ماہنامہ "شاعر" جاری کیا۔ ۱۹۵۱ء میں آگرے سے بمبئی منتقل ہوگئے اور وہاں سے "شاعر" جاری کیا، جو آج تک جاری ہے۔ آج کل اس کے مدیر اُن کے صاحبزادے افتخار امام صاحب ہیں۔ پنڈت نہرو پر ان کی طویل نظم "خوابوں کا مسیحا" ۱۹۶۶ء میں شائع ہوئی۔ ۱۹۷۹ء میں "قومی، وطنی اور سیاسی نظموں کا مجموعہ "کربِ خود کلامی" شائع ہوا۔ ۹ فروری ۱۹۷۸ء کو انتقال ہوا۔ (بہ شکریہ افتخار امام صاحب)

سعیدہ خاتون :۔ جوش صاحب کی صاحبزادی تھیں۔ بقول جوش ۱۹۱۷ء میں ملیح آباد میں اپنی نانی کے گھر پیدا ہوئی تھیں۔ حیدر آباد میں تعلیم پائی۔ ۱۹۳۶ء میں جوش نے اپنی چچازاد بہن کے بیٹے التفات احمد شہاب سے ان کی شادی کردی۔ اُن کے نو بچے تھے۔ جوش نے یادوں کی برات میں ان سب کے نام لکھے ہیں۔ (یادوں کی برات (دہلی، ۱۹۸۲ء): ۳۷۷ - ۳۷۸)۔

دیوان سنگھ مفتون :۔ مفتون، سردار دیوان سنگھ پنجاب (پاکستان) کے ضلع گجرانوالہ کے قصبہ حافظ آباد میں ۲۸ اگست ۱۸۹۰ء کو پیدا ہوئے۔ اُن کے والد ڈاکٹر ندھان سنگھ پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر تھے اور سرکاری ملازم تھے۔ دیوان سنگھ چالیس دن کے تھے کہ والد کا انتقال ہوگیا۔ تمام جائداد پر چچا نے قبضہ کرلیا اور

دیوان سنگھ کی والدہ اور بھائی بہن مفلسی کے شکار ہو گئے۔ دیوان سنگھ بمشکل تمام پانچویں جماعت تک پڑھ سکے۔ بہت کم عمری میں پانچ روپے ماہانہ پر ایک بجاج کی دُکان پر نوکری کی۔ دو تین برس بعد ایک اسپتال میں کمپاؤنڈر کی نوکری کرلی۔ اس کے بعد انھوں نے کئی چھوٹی موٹی ملازمتیں کیں۔ کچھ عرصے بعد صحافت کی دُنیا میں قدم رکھا۔ پہلے مختلف رسالوں میں مضامین لکھے۔ صحافت میں انھوں نے لکھنؤ پہنچ کر سیّد بشارت علی جالبؔ کا تلمذ اختیار کی۔ کچھ عرصے بعد لاہور آ گئے اور "ہندوستان" نام کے ایک اخبار میں ملازمت کر لی۔ ۱۹۲۰ء میں دہلی آئے اور خواجہ حسن نظامی مرحوم کے تعاون سے "رعیّت" نام سے ایک روزنامچہ جاری کیا۔ لیکن یہ اخبار چند مہینے سے زیادہ جاری نہیں رہ سکا۔ اس کے بعد مختلف شہروں میں ملازمت کے سلسلے میں گھومتے رہے۔ ۱۹۲۴ء میں ایک بنیئے سے ڈیڑھ ہزار قرض لیا اور دہلی سے "ریاست" نام سے ایک رسالہ جاری کیا۔ اس رسالے میں دیسی ریاستوں کے خلاف کُھل کر لکھا جاتا تھا جس کی وجہ سے مفتوں کو بہت شہرت حاصل ہوئی۔ ۱۹۶۰ء میں "ریاست" کی مالی حالت خراب ہو گئی اور "ریاست" کی اشاعت بند کرنی پڑی۔ مولانا ابوالکلام آزادؔ نے حکومتِ ہند سے ڈھائی سو روپے ماہانہ وظیفہ مقرر کرا دیا اور مولانا ہی کی سفارش پر حکومتِ پنجاب نے پانچ سو روپے ماہانہ مقرر کر دیا۔ مشہور فلمی رسالے "شمع" کے مالک اور مدیر یوسف دہلوی مرحوم نے دو سو روپے ماہوار دینا شروع کر دیا۔ مفتوں راج پورہ (ڈیرادون) منتقل ہو گئے۔ ۲۰ جنوری ۱۹۷۵ء کو غسل خانے سے نکلتے وقت پاؤں پھسل گیا۔ سر میں بہت سخت چوٹ آئی۔ خاندان کے لوگ انھیں دہلی لے آئے۔ یہیں ۲۶ جنوری ۱۹۷۵ء کو اُن کا انتقال ہو گیا۔ (تذکرۂ معاصرین)۔

منظر صدیقی :۔ پورا نام شمشاد حسین صدیقی تھا۔ اُردو کے مشہور و ممتاز شاعر سیماب اکبرآبادی کے سب سے بڑے صاحبزادے تھے۔ ۱۹۰۹ء میں کانپور میں پیدا ہوئے۔ منظرؔ نے آگرے کے مدرسہ عالیہ اور مدرسہ محمدیہ میں فارسی، عربی اور اُردو زبانیں پڑھیں۔ سیمابؔ صاحب کے ساتھ ماہانہ "پیمانہ" اور اشاعتی ادارے "قصر الادب" میں کام شروع کر دیا۔ بہت کم عمر تھے کہ شعر گوئی کا آغاز کیا۔ جنوری ۱۹۵۱ء میں جب کراچی

میں سیماب صاحب کا انتقال ہوگیا تو منظر صاحب کراچی چلے گئے۔ وہاں سے ایک ماہنامہ "پرچم" جاری کیا۔ ۲؍اکتوبر ۱۹۷۱ء کو انتقال ہوگیا۔ (بہ شکریہ افتخار امام صاحب)

سیّد مسعود حسن رضوی ادیب :۔ ان کے آباواجداد ایران سے آئے تھے۔ ہندوستان آکر اعلا عہدوں پر فائز ہوئے۔ ان کے والد سیّد مرتضیٰ حسین کو طبابت میں ملکہ حاصل تھا۔ ادیب ۲۹ جولائی ۱۸۹۳ء کو بہرائچ میں پیدا ہوئے۔ الہ آباد یونیورسٹی سے بی۔ اے اور لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم۔ اے کے امتحانات پاس کیے۔ ابتدا میں کچھ ملازمتیں کیں۔ ۲۹ سال کی عمر میں درس و تدریس کا پیشہ اختیار کیا۔ ساری زندگی اسی پیشے میں گزری۔ مشہور و ممتاز محقق اور نقّاد تھے۔ ۲۹ نومبر ۱۹۷۵ء کو انتقال ہوا اور لکھنؤ میں مدفون ہوئے۔ (مسعود حسن رضوی ادیب : حیات اور کارنامے)۔

گرامی، مولانا شیخ غلام قادر :۔ گرامی ۱۸۵۷ء سے کچھ قبل جالندھر میں پیدا ہوئے تھے۔ گرامی کے والد شیخ سکندر بخش نیل کی رنگائی کا کام کرتے تھے۔ ایک مکتب میں ابتدائی تعلیم حاصل کی اور یہیں درسی کتابیں "گلستاں"، "بوستاں" اور "سکندر نامہ" وغیرہ پڑھیں۔ مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے لاہور آگئے۔ چودہ سال کی عمر میں اورینٹل کالج لاہور میں داخل ہوئے اور فارسی کے منشی عالم اور منشی فاضل کے امتحانات پاس کرکے وکالت کا امتحان دیا۔ اس امتحان میں بھی کامیابی حاصل کی لیکن وکالت کو پیشہ نہیں بنایا۔ تعلیم مکمل کرکے مختلف مقامات کی سیر کرتے ہوئے حیدرآباد پہنچے۔ ۲۷ مئی ۱۹۲۷ء کو ہوشیار پور میں انتقال ہوا۔ گرامی کی ساری زندگی درس و تدریس میں گزری۔ اُن کی کئی اُردو فارسی تصنیفات شائع ہو چکی ہیں، جن کی تفصیل "مکاتیب اقبال بنام گرامی" میں دی گئی ہے۔ (مکاتیب اقبال، تذکرہ مہ و سال، ص ۳۲۳)۔

راس مسعود، سر :۔ سرسیّد احمد خاں کے پوتے اور جسٹس سیّد محمود کے اکلوتے صاحبزادے تھے۔ ۱۵؍فروری ۱۸۸۹ء کو علی گڑھ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۰۵ء میں دسویں کا امتحان پاس کیا۔ برطانیہ کے لیے سرکاری وظیفہ مل گیا۔ انھیں انگلینڈ کے نیو کالج (آکسفورڈ) میں داخل کرادیا گیا۔ ۱۹۱۰ء میں بی۔ اے (آنرز) کرکے آکسفورڈ سے لندن آگئے، یہاں سے بیرسٹری

کی ڈگری حاصل کی۔ ہندوستان آکر انھوں نے وکالت شروع کی۔ کچھ دن بعد انڈین ایجوکیشنل گورنمنٹ ہائر سیکنڈری اسکول (پٹنہ) کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔ ۱۹۱۶ء میں ریون شاہ کالج، کٹک (اڑیسہ) میں تاریخ کے سینئر پروفیسر مقرر ہوئے۔ کچھ دن بعد حیدرآباد ریاست کے ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن مقرر ہوئے۔ ۱۹۲۹ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے۔ ۱۹۳۴ء میں وائس چانسلری سے استعفیٰ دے دیا اور بھوپال ریاست میں وزیر تعلیم اور امور عامہ مقرر ہو گئے۔ ۳۰ جولائی ۱۹۳۷ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔ (ارشد مسعود گنگوہی، سر راس مسعود، مشمولہ، سہ ماہی فکر و نظر۔ نامورانِ علی گڑھ، ۱۹۸۶ء، ص ص ۲۹۲ - ۳۰۰)۔

خورشید علی خاں :۔ ۱۹۲۲ء میں ریاست حیدرآباد (دکن) میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد جناب یحییٰ خاں موضع حسن پور لوہاری، ضلع مظفر نگر (یوپی) کے تھے۔ اور حیدرآباد (دکن) میں آبکاری کے محکمہ میں ملازم تھے۔ خورشید علی خاں صاحب نے جامعہ عثمانیہ سے بی۔اے اور ایل۔ایل۔بی کے امتحانات پاس کیے۔ اس کے بعد حیدرآباد پولیس سروس کا امتحان پاس کر کے اے۔ایس۔پی کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ ایک سال بعد یعنی مارچ ۱۹۵۹ء میں کراچی چلے گئے اور آج تک وہیں مقیم ہیں۔ پاکستان میں وہ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۸۲ء تک محکمۂ بحری کسٹم کے اعلا عہدوں پر فائز رہے۔ ریٹائر ہو کر تصنیف و تالیف میں مصروف ہو گئے۔ ان کی ایک کتاب "کیفی اعظمی۔ شخصیت اور فن" دوسری "ہمارے جوش صاحب" اور تیسری "فکرِ غالب" ہیں۔ (ہمارے جوش صاحب)

ہلال نقوی، ڈاکٹر :۔ ۱۹۵۰ء میں راولپنڈی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سید مزمّل حسین نقوی امروہہ کے رہنے والے ہیں۔ بفضلِ تعالیٰ باحیات ہیں۔ ہلال صاحب نے ۱۹۷۳ء میں کراچی یونیورسٹی سے اُردو میں ایم۔اے کیا۔ اسی یونیورسٹی سے ۱۹۸۵ء میں "بیسویں صدی اور جدید مرثیہ" کے موضوع پر پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۷۴ء میں ایک کالج میں لیکچرر ہو گئے۔ آج کل گورنمنٹ ڈگری کالج، گلشنِ اقبال، کراچی میں صدرِ شعبۂ اُردو ہیں۔ چودہ پندرہ کتابوں کے مصنف اور مرتب ہیں۔ مرثیہ اُن کا خاص میدان ہے۔ شعر گوئی سے بھی دلچسپی ہے۔ ڈی لٹ کے لیے جوش پر تحقیقی مقالہ لکھ رہے ہیں۔

(جوش ملیح آبادی کی نادر و غیر مطبوعہ تحریریں، جلد اوّل، ص ۱۳۶ — راغب مراد آبادی (مرتب) خطوطِ جوش ملیح آبادی، ص ۲۴۰ - ۲۳۹)

سیّدہ اختر:۔ اصل نام سرداری بیگم اور اختر تخلّص تھا۔ سیدہ اختر کے نام سے مشہور ہوئیں۔ سید امیر حسن کی صاحبزادی تھی۔ سیّدہ کے جدِّ امجد نواب سید کریم حسن قمر لکھنوی، داغ کے شاگرد تھے۔ ۹ مارچ ۱۹۱۸ء کو حیدر آباد میں پیدا ہوئیں۔ چار سال کی تھیں کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ رشتے کے ایک چچا سید محبوب علی نے پرورش کی۔ عربی، فارسی اور اُردو کی تعلیم گھر پر ہوئی۔ ۱۹۳۲ء میں خان بہادر عبدالمغنی خاں آرمی کنٹریکٹر اور رئیس اعظم نصیر آباد چھاؤنی (راجپوتانہ) کے ساتھ شادی ہوئی۔ شاعروں کی سرپرست تھیں۔ خود بھی شاعرہ تھیں۔ اُن کے جاننے والوں میں شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہو، جس کی انھوں نے مالی مدد نہ کی ہو۔ جوش نے انھیں "ناہیدِ سخن" کا خطاب دیا تھا، جس کا انھیں ایک ہزار روپے معاوضہ ملا تھا۔ انھوں نے ۱۹۴۲ء میں بنگلور میں ایک تاریخی مشاعرہ کیا تھا۔ جس کا ذکر اکثر کتابوں میں ملتا ہے۔ اس مشاعرے میں جوش، ساغر، سیماب، یگانہ، جگر، اختر شیرانی وغیرہ شریک ہوئے تھے۔ حکیم امام امامی نے خطاب کا ذکر اپنی کتاب "نقوشِ تاثرات (ص ۲۷۱ - ۲۷۲) میں کیا ہے۔ پہلے "خاکسار تحریک" اور مسلم لیگ کی سرگرم ممبر رہیں۔ ۲ اکتوبر ۱۹۷۳ء کو بنگلور میں وفات ہوئی۔ اپنے سکونت کے بنگلے "السور" میں دفن ہوئیں۔ ان کے نعتوں کا مجموعہ "صحیفۂ درخشاں" اور اقبال کی بعض نظموں کی تضمین "تضمینِ اقبال" کے نام سے شائع ہو چکی ہیں۔ (تذکرۂ معاصرین، جلد ۲: ۱۹۸ — ۲۰۰، تذکرۂ نسواں ہند: ۱۳۸ — ۱۳۹۔ ڈاکٹر شفیع احمد شریف اور مشفق خواجہ صاحب نے بھی معلومات فراہم کیں۔

دل شاہ جہاں پوری، حکیم ضمیر حسن خاں:۔ دل شاہ جہاں پور میں ۱۸۷۵ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد حکیم جمال الدین عرف قدرت علی خاں شاہ جہاں پور کے بڑے مشہور حکیموں میں تھے۔ دل شاہ جہاں پوری نے شاہ جہاں پور ہی میں عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کر کے فقہ، حدیث و تفسیر پڑھی اور پھر مولوی حکیم محمد سے علمِ طب حاصل کیا۔ شاعری میں امیر مینائی کے شاگرد تھے۔ اُن کی ساری زندگی طبابت کے پیشے اور شعر

وشاعری میں گزری۔ ۲۶ دسمبر ۱۹۵۹ء کو بعارضہ فالج شاہجہاں پور میں انتقال ہوا۔
(دبستانِ امیر مینائی، ص ۲۰۱-۲۰۲)۔

صفدر آہ سیتاپوری، سید محمد صفدر :- ۱۹۰۵ء میں سیتاپوری (اودھ) میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام قاضی سید محمد حیدر تھا۔ تعلیم سیتاپور اور لکھنؤ میں ہوئی۔ یہ تعلیم انھوں نے غالباً اپنے شوق سے گھر پر اور مکاتیب میں حاصل کی۔ کیوں کہ ان کے پاس کوئی ڈگری نہیں تھی۔ کہا جاتا ہے کہ انھیں عربی، فارسی، ہندی اور انگریزی زبانوں پر قدرت حاصل تھی۔ ۱۹۲۸ء میں انھوں نے اُردو میں ہفت روزہ "حافظ" اور ۱۹۳۴ء میں ہندی میں "جنتا" نام سے رسالہ نکالنا شروع کیا۔ انھوں نے تنقید، تحقیق، ڈرامہ، ناول، افسانہ اور شاعری جیسے میدانوں میں اپنے جوہر دکھائے۔ ۱۹۳۸ء میں فلمی دنیا سے وابستہ ہوئے اور فلمی گانے لکھتے رہے۔ ۱۹۵۹ء میں دل کا دورہ پڑا تو سب کام چھوڑ گوشہ نشینی اختیار کرلی۔ اُن کی تصنیفات میں "میر اور میریات"، "تلسی داس اور رام چرت مانس" اور "ہندوستانی ڈرامہ" وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ ۲۹ جولائی ۱۹۸۰ء کو گنیشوری (بمبئی) میں انتقال ہوا۔ (صفدر آہ: ۷، نثر نگارانِ اردو: ۱۸۰-۱۸۲)

جمیل خاں :- مسیح الملک حکیم اجمل کے صاحبزادے تھے۔ حکمت کرتے تھے، لیکن اس فن پر وہ مہارت حاصل نہیں ہوسکی، جو اُن کے والد کو تھی۔ ۱۶ جنوری ۱۸۹۸ء کو دہلی (شریف منزل، بلیماران) میں ولادت ہوئی۔ تقسیمِ ہند کے کچھ عرصے بعد پاکستان ہجرت کر گئے۔ ۲۴ ستمبر ۱۹۷۰ء کو فالج کے مرض میں لاہور میں انتقال ہوا۔ (تذکرۂ ماہ و سال: ۱۱۸)۔

تمکین کاظمی :- سید محمد تمکین نام تھا۔ ۲۷ نومبر ۱۹۰۲ء کو حیدرآباد میں ولادت ہوئی۔ مشہور شاعر اور ادیب تھے۔ ۲۷ مئی ۱۹۶۱ء کو عارضۂ قلب میں انتقال ہوگیا۔ (تذکرہ ماہ وسال: ۱۰۵)

نواب مہدی یار جنگ بہادر

سید مہدی حسین نواب مہدی یار جنگ بہادر سابق ریاست حیدر آباد کی جلیل القدر شخصیت نواب عماد الملک بہادر کے سب سے چھوٹے فرزند تھے۔ وہ ۲۸ جولائی ۱۸۸۱ء کو حیدر آباد میں پیدا ہوئے۔ آکسفورڈ یونیورسٹی سے ایم۔ اے کی ڈگری لی۔ ابتداً میں ۱۹۰۷ء میں صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ میں صدر مہتمم مدارس کی خدمت پر تقرر ہوا۔ ۱۹۱۲ء میں ریاست حیدر آباد میں نائب معتمد سیاسیات کا ایک نیا عہدہ قائم کر کے انھیں اس پر مامور کیا گیا۔ انھیں جلد ہی معتمد سیاسیات کے عہدوں پر ترقی ملی۔ ۳ جنوری ۱۹۳۰ء کو صدر المہام (وزیر) سیاسیات مقرر ہوئے۔ وہ اٹھارہ سال تک مسلسل ریاست حیدر آباد کی کابینہ میں رہے اور ۱۹۴۷ء میں منصرم صدر اعظم کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیں۔ وہ جامعہ عثمانیہ کے پرو چانسلر، دائرۃ المعارف، اسلامک کلچر بورڈ اور کمیٹی دستوری سرکار عالی کے صدر بھی تھے۔ اُن کا ۱۸ اپریل ۱۹۴۸ء کو انتقال ہوا۔

مہدی یار جنگ بے مثل علمی قابلیت کے حامل تھے، انھیں اُردو اور انگریزی تحریر و تقریر میں مہارت حاصل تھی۔ وہ ہمیشہ ادیبوں اور شاعروں کی قدر افزائی اور سرپرستی کیا کرتے تھے۔

مہدی یار جنگ جوؔش کے قدر دان تھے اور جوؔش سے اُن کے مراسم دوستانہ تھے۔ خود جوؔش نے "یادوں کی برات" میں لکھا ہے کہ حیدر آباد کی ملازمت کے لیے سر اکبر حیدری کا وسیلہ گنوانے کے بعد جوؔش کو مہدی یار جنگ اپنے والد نواب عماد الملک بہادر کے پاس لے گئے تھے اور انھوں نے جوؔش کا اپنے والد سے اچھے الفاظ میں تعارف کرایا تھا۔ نواب میر عثمان علی خاں حکمراں ریاست کے نام عماد الملک کی سفارشی درخواست پر ہی حیدر آباد میں جوؔش کی ملازمت کی کارروائی کا آغاز ہوا تھا۔ (تذکرۂ باب حکومت۔ سید منظر علی اشہر، مناظر الکرام، حیدر آباد، ۱۹۴۵ء)

خطوط کے آماخذ

اس عنوان کے تحت زیر نظر کتاب میں شامل خطوط کے ماٰخذ کی نشان دہی کی گئی ہے۔ ان میں اصل خطوط بھی ہیں۔ کچھ خطوط کی زیروکس ہیں اور بہت سے ایسے خطوط بھی ہیں جو چھپے ہوئے رسالوں اور کتابوں سے لیے گئے ہیں۔ یہ سب خطوط انجمن ترقی اردو (ہند) کے اردو آرکائوز میں محفوظ ہیں۔

- مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام یہ خطوط سعید الظفر چغتائی صاحب نے مرتب کر کے ماہنامہ ''آجکل'' دہلی کے دو شماروں مارچ ۱۹۹۲ء اور جون ۱۹۹۲ء میں شائع کرائے تھے۔
- شیخ منظور الٰہی کے نام ان دونوں خطوط کے اصل کی زیروکس کاپیاں مشفق خواجہ صاحب نے فراہم کی تھیں۔
- سجاد ظہیر کے نام یہ خط ''نقوش'' کے خطوط نمبر (ص: ۴۴۹) میں شائع ہوا تھا۔
- اختر حسین کے نام ان دونوں خطوط کی زیروکس کاپیاں مشفق خواجہ صاحب نے بھیجی تھیں۔
- مشفق خواجہ صاحب نے اپنے نام ان دونوں خطوط کی زیروکس کاپیاں فراہم کی تھیں۔
- ظفر ادیب صاحب نے خود اصل خط مجھے عنایت فرمائے تھے۔
- جدن بائی کے نام اس خط کی زیروکس مشفق خواجہ صاحب نے فراہم کی تھی۔
- جمیل مظہری صاحب کے خط کی نقل بھی مشفق خواجہ صاحب نے فراہم کی تھی۔
- کنور مہندر سنگھ بیدی صاحب کے نام جوش کے بہت خطوط تھے۔ بیشتر خطوط ضائع ہو گئے۔ بہت کوشش کے بعد چھ خطوط مل سکے۔ یہ خطوط بیدی صاحب نے خود عنایت فرمائے تھے۔
- شنکر پرشاد صاحب کے نام تمام اصل خطوط بیگم ممتاز میرزا مرحومہ کے پاس تھے۔ انھوں نے ہی یہ خطوط مجھے عنایت فرمائے تھے۔
- رام پرکاش ساحر ہوشیارپوری مرحوم نے اپنے نام جوش کے یہ آٹھ خطوط خود مجھے دیے تھے۔
- ابوالکلام آزاد کے نام جوش کے اس خط کی زیروکس کاپی خدا بخش لائبریری کے ڈائرکٹر جناب حبیب الرحمٰن چغتائی نے ارسال فرمائی تھی۔

○ڈاکٹر جمیل جالبی کے نام اس خط کی نقل ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے بھیجی تھی۔

○ میکش اکبر آبادی کے نام یہ دونوں خط "نقوش" کے خطوط نمبر (ص ص ۵۶۰۔۵۹۹) میں شائع ہوئے تھے۔

○اعجاز صدیقی صاحب کے نام یہ خط ان کے صاحب زادے افتخار امام صدیقی کے توسط سے ملا۔

○سیدہ خاتون کے نام یہ خطوط ہلال نقوی صاحب نے اپنی کتاب "جوش ملیح آبادی کے نادر و غیر مطبوعہ تحریریں" میں شائع کیے ہیں۔

○داؤد رہبر صاحب نے اپنے ایک مضمون "جوش ملیح آبادی بنام سردار دیوان سنگھ مفتون" مشمولہ ششماہی "غالب" کراچی، ۱۹۹۵ء (ص ص ۶۹۔۶۸) میں نقل کیا ہے۔ انھیں یہ خط پنجابی کے مشہور ادیب پروفیسر ہربنس سنگھ نے دیا تھا۔

○منظر صدیقی مرحوم کے نام یہ خط سیماب اکبر آبادی کی ۳۵ ویں برسی (۱۹۸۶ء) پر سیماب اکیڈمی کراچی نے ایک یادگار مجلّہ شائع کیا تھا۔ جس میں یہ خط بھی شامل تھا۔ مشفق خواجہ صاحب نے اس خط کی نقل ارسال فرمائی تھی۔

○سید مسعود حسن رضوی ادیب کے نام یہ خطوط مشاہیر کے خطوط، مرتبہ نیر مسعود میں شائع ہوئے ہیں۔

○مولانا شیخ غلام قادر گرامی کے نام اس خط کا مآخذ مجھے یاد نہیں ہے۔

○سر راس مسعود کے نام یہ خطوط مشفق خواجہ صاحب نے ارسال فرمائے تھے۔

○خورشید علی خاں صاحب کے نام جوش کے یہ خطوط ان کی کتاب "ہمارے جوش صاحب" میں شامل ہیں۔ مگر کتاب چھپنے سے بہت پہلے مشفق خواجہ صاحب نے اصل خطوط کے زیروکس مجھے بھیج دیے تھے۔

○ڈاکٹر ہلال نقوی کے نام یہ خطوط ان کی مرتبہ کتاب "جوش ملیح آبادی کے نادر و غیر مطبوعہ تحریریں" میں شائع ہوئے ہیں۔ اصل خطوط کی زیروکس کاپیاں مشفق خواجہ صاحب نے مجھے عنایت فرمائی تھیں۔

○شان ہند، دہلی کے اپریل ۱۹۷۴ء کے شمارے میں ایک مقالہ "شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی اپنے خطوط کے آئینے میں" میں شائع ہوا تھا جس میں سیدہ اختر کے نام یہ خطوط شامل ہیں۔ ان کے علاوہ خود سیدہ اختر کے چھ خطوط ہیں جو مرحومہ نے جوش کو لکھے تھے۔ سیدہ اختر کے یہ خطوط جوش کی شخصیت کو سمجھنے کے سلسلے میں بہت دل چسپ اور اہم ہیں۔ مطبوعہ صورت میں یہ خطوط انجمن میں محفوظ ہیں۔

○دل شاہ جہاں پوری کے نام پہلا خط مشفق خواجہ صاحب نے اور باقی دو خطوط افتخار امام صاحب نے عنایت فرمائے ہیں۔

○ ڈاکٹر صفدر آہ سیتاپوری کے نام یہ خط "نقوش" کے خطوط نمبر (ص ۴۵۰) میں شائع ہوا تھا۔

○ حکیم جمیل خاں کے نام یہ خط حکیم محمد امام امامی نے اپنی کتاب "نقوشِ تاثرات" (ص ۲۶۶) میں نقل کیا ہے۔

○ تمکین کاظمی کے نام یہ خط "نقوش" "خطوط نمبر (ص ۳۳۲) میں شائع ہوا تھا۔

○ مہاراجا کشن پرشاد شاد کے نام علامہ اقبال کا یہ خط کلیاتِ مکاتیب اقبال (جلد ۲، ص ۵۰۳) میں شامل ہے۔

○ "فقیر کی صدا" یہ نظم جوش نے "شوکت عثمانی" کے پراجیکٹ میں شامل کر کے نواب میر عثمان علی خاں کی خدمت میں پیش کی تھی۔ یہ نظم پہلی بار مائل ملیح آبادی کی "مرتبہ جوش اور دیارِ دکن" میں شائع ہوئی تھی۔ میں نے وہیں سے نقل کی ہے۔

○ شوکت عثمانی کے ابتدائی دو صفحات بھی "جوش اور دیارِ دکن" (ص ص ۱۱۸۔۱۲۰) میں شامل ہیں۔

○ نواب امین جنگ کے نام سر اکبر حیدری کے خط کا عکس (بیرونی مشاہیر ادب: ۱۱۲)

○ عماد الملک کا خط نواب میر عثمان علی خاں کے نام (بیرونی مشاہیر ادب: ۱۱۳)

○ سر اکبر حیدری کے نام مہاراجا کشن پرشاد کا سفارشی خط (جوش اور دیارِ دکن: ۱۰۰۔۱۰۱)

○ نواب میر عثمان علی خاں کا فرمان (بیرونی مشاہیر ادب: ۱۱۳)

○ نواب میر عثمان علی خاں کی خدمت میں جوشؔ کی درخواست (جوش اور دیارِ دکن) نواب میر عثمان علی خاں کا فرمان (بیرونی مشاہیر ادب: ۱۱۴)

○ نواب میر عثمان علی خاں کے نام جوش کا معافی نامہ (بیرونی مشاہیر ادب: ۱۲۴۔۱۲۶)

○ جوش کے اخراج حیدر آباد کے سلسلے میں نواب میر عثمان علی خاں کے پانچ فرامین (بیرونی مشاہیر ادب: ۱۲۳۔۱۲۹)

○ نواب مہدی یار جنگ کے نام جوش کا یہ خط (۱۳۲۔۱۳۳) ۱۹۴۴ء کا میر عثمان علی خاں کا فرمان اور مددگار معتمد کے نام جوش کا خط یہ تینوں تحریریں بیرونی مشاہیر ادب (ص ۱۳۲۔۱۳۳) میں شائع ہوئی ہیں۔

کتابیات

۱۔ ارمغان (سہ ماہی) کراچی، اپریل، مئی جون ۱۹۹۶ء، (جمیل جالبی نمبر)

۲۔ اقبال، مکاتیب اقبال، مرتبہ سید مظفر حسین برنی، دہلی، ۱۹۹۳ء

۳۔ اسماء رفعت حسین، اربابِ اردو: ۳، لکھنؤ ۱۹۹۶ء

۴۔ اشرف، ڈاکٹر سیّد داؤد، بیرونی مشاہیر ادب، حیدر آباد، ۱۹۹۰ء

۵۔ اشہر، سید منظر علی، مناظر الکرام، حیدر آباد، ۱۳۴۵ھ

۶۔ امامی، حکیم امام، نقوشِ تاثرات، بنگلور، ۱۹۵۸ء

۷۔ بلخی، فصیح الدین، تذکرہ نسوانِ ہند، پٹنہ، ۱۹۵۶ء

۸۔ بیدی، کنور مہندر سنگھ، یادوں کا جشن، دہلی

۹۔ تحسین فاروقی، عبد الماجد: احوال و آثار، لاہور، ۱۹۹۳ء

۱۰۔ جعفر حسین مرزا، بیسویں صدی کے بعض لکھنوی ادیب: اپنے تہذیبی پس منظر میں، لکھنؤ ۱۹۸۷ء

۱۱۔ جوش ملیح آبادی، یادوں کی برات، دہلی، ۱۹۸۲ء

۱۲۔ جلیلی، علی احمد، فصاحت جنگ جلیل مانک پوری، حیدر آباد، ۱۹۹۳ء

۱۳۔ خلیق انجم (مرتب) مشفق خواجہ۔ ایک مطالعہ، نئی دہلی، ۱۹۸۵ء

۱۴۔ خورشید علی خاں، ہمارے جوش صاحب، کراچی، ۱۹۹۶ء

۱۵۔ دریابادی، عبد القوی، مولانا عبد الماجد: حیات و خدمات، لکھنؤ، ۱۹۷۸ء

۱۶۔ دستاویز (مصنفین کے اپنے قلم سے) لکھنؤ، ۱۹۸۳ء

۱۷۔ راز، راج نرائن (مرتب) خواجہ احمد عباس: افکار، گفتار، کردار، پنچکولہ، ۱۹۹۸ء

۱۸۔ راغب مراد آبادی، رگِ گفتار، کراچی، ۱۹۸۹ء

۱۹۔ راغب مراد آبادی (مرتب)، خطوط جوش ملیح آبادی، کراچی، ۱۹۹۳ء

۲۰۔ زرینہ ثانی، صفدر آہ، دہلی، ۱۹۷۹ء

۲۱۔ ساقی، کے۔ ایل۔ نارنگ (مرتب)، ہمارے کنور صاحب، دہلی، ۱۹۸۶ء

۲۲۔ ش د، مرلی دھر، گل وانجام، دہلی، ۱۹۵۰ء
۲۳۔ صغرا مہدی، پروفیسر، اکبر کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ، دہلی، ۱۹۸۱ء
۲۴۔ طاہر تونسوی، مسعود حسن رضوی ادیب: حیات اور کارنامے، لاہور، ۱۹۸۹ء
۲۵۔ عبدالماجد، مولانا، آپ بیتی، لکھنؤ، ۱۹۷۸ء
۲۶۔ عتیق احمد، بنّے بھائی (سجاد ظہیر)، کراچی، ۱۹۹۱ء
۲۷۔ عرفان عباسی، دبستانِ امیر مینائی، لکھنؤ، ۱۹۹۵ء
۲۸۔ عرفان عباسی، نثر نگارانِ اردو، جلد: ۱، لکھنؤ، ۱۹۹۱ء
۲۹۔ قریشی، عبداللہ، مکاتیبِ اقبال، لاہور، ۱۹۸۱ء
۳۰۔ گیتاپد منی سین، سروجنی نائیڈو، مترجمہ ڈاکٹر اسلم پرویز، دلی، ۱۹۸۷ء
۳۱۔ گوہر نوشاہی، ڈاکٹر، ڈاکٹر جمیل جالبی: ایک مطالعہ، دہلی، ۱۹۹۳ء
۳۲۔ مالک رام، تذکرہ معاصرین، جلد ۲، دہلی، ۱۹۷۶ء
۳۳۔ مالک رام، تذکرہ معاصرین، جلد ۳، دہلی، ۱۹۷۸ء
۳۴۔ مالک رام، تذکرہ معاصرین، جلد ۴، دہلی، ۱۹۸۲ء
۳۵۔ مالک رام، تذکرہ معاصرین، جلد ۵، دہلی، ۱۹۸۲ء
۳۶۔ مالک رام، تذکرہ ماہ و سال، دہلی، ۱۹۹۱ء
۳۷۔ مائل ملیح آبادی، جوش اور دیارِ دکن، لکھنؤ، ۱۹۸۴ء
۳۸۔ محمد مظہر، تذکرہ بابِ حکومت، حیدر آباد، ۱۹۴۵ء
۳۹۔ مصطفیٰ نذیر احمد، نادر خطوط کا ایک مجموعہ، مشمولہ شش ماہی غالب نامہ، شمارہ: ۱۱ تا ۱۸، ۱۹۹۵ء
۴۰۔ مہاراجا کشن پرشاد، حیدر آباد دکن، ۱۹۵۰ء، یہ کتاب ایک کمیٹی کی طرف سے شائع کی گئی تھی اور اس کے مرتب کا نام نہیں دیا گیا تھا۔
۴۱۔ نقوی، امام مرتضیٰ، خواجہ حسن نظامی: حیات اور ادبی خدمات، لکھنؤ، ۱۹۷۸ء
۴۲۔ نیّر مسعود (مرتب) مشاہیر کے خطوط، لکھنؤ ۱۹۸۵ء
۴۳۔ ہلال نقوی (مرتب) جمیل مظہری کے مرثیے، کراچی، ۱۹۸۸ء
۴۴۔ ہلال نقوی، (مرتب)، جوش ملیح آبادی کی نادر و غیر مطبوعہ تحریریں، کراچی، ۱۹۹۲ء

عبدالماجد دریابادی:

۱؎ اکبر سے مراد اردو کے مشہور شاعر اکبر الہ آبادی ہے۔ ان کے والد کا نام سید تفضل حسین تھا۔ اکبر کی پیدائش ۱۶ رنومبر ۱۸۴۶ء کو الہ آباد کے بارہ ضلع میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم داؤد نگر ضلع شاہ آباد اور الہ آباد میں ہوئی۔ الہ آباد کی عدالت میں معمولی عہدے سے کام شروع کیا اور سیشن جج کے عہدے تک ترقی کی۔ ۹ر ستمبر ۱۹۲۱ء کو الہ آباد میں انتقال ہو گیا۔ اکبر کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ: ۵۴۔۷۷) ۲؎ عزیز لکھنوی ۱۴ر مارچ ۱۸۸۲ء کو پیدا ہوئے۔ اردو کے ممتاز شاعر اور صفی لکھنوی کے شاگرد تھے۔ ۳۰ر جولائی ۱۹۳۵ء کو لکھنؤ میں انتقال ہوا (تذکرہ ماہ و سال: ۲۷۳) ۳؎ سید جالب دہلوی: پورا نام سید بشارت علی جالبؔ دہلوی تھا۔ ۱۸۷۴ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ مرزا داغ کے شاگرد اور مشہور صحافی تھے۔ ۲۵ر جولائی ۱۹۳۰ء کو لکھنؤ میں انتقال ہوا (تذکرہ مہ و سال: ۱۱۳) ۴؎ خواجہ حسن نظامی کے والد کا نام سید عاشق علی تھا۔ خواجہ صاحب ۲۵ر دسمبر ۱۸۷۸ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کا بچپن سخت مالی دشواریوں میں گزرا۔ خواجہ صاحب اپنی غیر معمولی ذہانت صلاحیتوں، اور محنت کی وجہ سے اردو کے صاحب طرز اور صف اول کے ادیبوں میں شمار ہوئے۔ انھوں نے صحافت کے میدان میں ممتاز ترین مقام حاصل کیا۔ مرحوم قابل احترام صوفی تھے۔ ۳۱ر جولائی ۱۹۵۵ء کو دہلی میں انتقال ہوا۔ (خواجہ حسن نظامی: حیات اور ادبی خدمات) ۵؎ برن کسی سرکاری عہدے پر فائز تھے۔ مجھے ان کے حالات معلوم نہیں ہو سکے۔ ۵(الف) رابندر ناتھ ٹیگور سے جوشؔ کی پہلی ملاقات لکھنؤ میں ہوئی۔ جوشؔ ٹیگور سے پہلے ہی متاثر تھے۔ اس ملاقات میں ٹیگور بھی جوشؔ سے متاثر ہوگئے۔ سروجنی نائیڈو نے ٹیگور کو جوشؔ کی نظم "طلوعِ سحر" سنائی تھی، جو انھیں بہت پسند آئی تھی۔ اس نظم کے حوالے سے ٹیگور نے اس پہلی ملاقات میں جوش کو "فرزندِ سحر گاہ" کہا تھا۔ ٹیگور نے جوش کو اپنی درس گاہ شانتی نکیتن آنے کی دعوت دی۔ جوش نے بخوشی منظور کرلی۔ کچھ عرصے بعد جوشؔ شانتی نکیتن چلے گئے اور چھ مہینے وہاں رہے۔ جوشؔ نے یہ واقعات یادوں کی برات میں خاصی تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ (یادوں کی برات: ۱۹۶۔۲۰۰) ۶؎ مہاراجہ کشن پرشاد صاحبزادے تھے راجا ہری کشن کے۔ ۲۸ر جنوری ۱۸۶۴ء کو پیدا ہوئے۔ فارسی، عربی، انگریزی اور سنسکرت کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی۔ خطاطی، تیر اندازی، بنوٹ، موسیقی اور شہسواری کے ماہر تھے۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ کشن پرشاد ابھی نوجوان تھے کہ نواب حیدر آباد نے انھیں وزارتِ فوج کے عہدے پر فائز کردیا۔ بعد میں حیدر آباد ریاست کے مدار المہام اور صدر اعظم کے عہدوں پر فائز رہے۔ نظم و نثر میں "پچھتر کے قریب تصنیفات تھیں۔ ۹ر مئی ۱۹۴۰ء کو

حیدر آباد میں انتقال ہوا۔ (مہاراجہ کشن پرشاد کی زندگی کے حالات) [۷] اکبر حیدری۔ پورا نام اکبر نذر علی حیدری تھا۔ بمبئی کے مشہور تاجر نذر علی کے صاحبزادے تھے۔ ۸ر نومبر ۱۸۶۹ء کو بمبئی میں ولادت ہوئی۔ بمبئی میں تعلیم حاصل کی۔ پہلے برطانوی حکومت میں اعلا عہدوں پر فائز رہے۔ پھر حیدر آباد ریاست میں ان کا صدر محاسبی کے عہدے پر تقرر ہوا۔ جامعہ عثمانیہ اور دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کے قائم کرنے میں انھوں نے ہی اہم رول ادا کیا۔ حیدر آباد ریاست میں وزیر اعظم بھی رہے۔ نواب میر عثمان علی خاں نے حیدر نواز جنگ کا خطاب عطا کیا اور سرکار انگریزی نے K.C.S.I نائٹ ہڈ "یعنی سر" کے خطاب سے نوازا۔ ۱۹۴۵ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ (بہ شکریہ جناب ایم۔ اے۔ کے۔ فاطمی)۔ [۸] خواجہ حسن نظامی سے مراد ہے۔ [۹] جوش "شوکت عثمانی" کے عنوان سے حیدر آباد ریاست کی منظوم تاریخ لکھنا چاہتے تھے۔ انھوں نے تقریباً ۳۷ شعر کہہ کر نواب کی خدمت میں پیش کیے۔ مگر یہ بات آگے نہیں بڑھی۔ میرے علم میں نہیں ہے کہ جوش نے "شوکت عثمانی" کے بارے میں کبھی کچھ کہا ہو یا لکھا ہو۔ انھوں نے اس حقیقت کو ہمیشہ راز رکھا۔ مائل ملیح آبادی نے "جوش اور دیار دکن" میں اس منظوم تاریخ کی تفصیل بیان کی ہے۔ [۱۰] اختر مینائی، لطیف احمد۔ امیر مینائی کے چوتھے صاحبزادے تھے۔ ۱۸۷۱ء میں ولادت ہوئی۔ ان کی تعلیم و تربیت رام پور میں ہوئی۔ جہاں امیر مینائی دربار رام پور سے وابستہ تھے۔ جب امیر مینائی رام پور سے حیدر آباد گئے تو اختر مینائی بھی ساتھ تھے۔ کچھ دن اپنے والد کے شاگرد رہے اور پھر جلیل مانک پوری کا تلمذ اختیار کر لیا۔ طویل عرصے تک حیدر آباد ریاست میں ملازم رہے۔ نواب حیدر آباد نے نواب اختر یار جنگ کے خطاب سے نوازا۔ ۲۹ر جولائی ۱۹۴۰ء کو حیدر آباد میں انتقال ہوا۔ (دبستان امیر مینائی ۵۹۔۶۰۔ تذکرہ ماہ و سال: ۳۶) [۱۱] جلیل مانک پوری، جلیل حسن۔ اتر پردیش کے ضلع پرتاب گڑھ کے تحصیل کنڈہ کے قصبے مانک پور میں ۱۸۶۲ء میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام عبدالکریم تھا۔ مشرقی تعلیم حاصل کی۔ امیر مینائی کے شاگرد تھے۔ پہلے نواب رام پور کے ملازم رہے اور پھر حیدر آباد آ گئے۔ کچھ عرصے بعد محبوب علی خاں آصف والیِ دکن کے استاد ہو گئے۔ میر محبوب علی خاں کے انتقال کے بعد میر عثمان علی خاں نے انھیں بطور حکیم ملازمت دے دی۔ ۶ر جنوری ۱۹۴۶ء کو انتقال ہو گیا۔ (فصاحت جنگ جلیل مانک پوری ۱۵۔۹۸) [۱۲] طالع سوا، مرزا محمد ہادی: مرزا آغا محمد تقی کے صاحبزادے تھے۔ ۱۸۵۷ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ عربی فارسی کی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ شاعری میں پہلے مرزا دبیر اور پھر اوج لکھنوی کے شاگرد ہو گئے۔ پنجاب یونی ورسٹی سے منشی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ انٹرنس کا امتحان پرائیوٹ امیدوار کے طور پر پاس کیا۔ رڑکی میں ریاضی اور اقلیدس کی تعلیم حاصل کی۔

ریلوے میں سب اوورسیئر کے طور پر ملازم ہوگئے۔ کچھ عرصے بعد کرسچن اسکول میں استاد کی حیثیت سے ملازمت اختیار کرلی۔ برن کالج میں بھی رہے۔ ان کے تین ناول امراؤ جان ادا۔ ذات شریف اور شریف بہت مشہور ہیں۔ کئی مذہبی کتابیں بھی لکھیں۔ لکھنؤ چھوڑ کر حیدر آباد آگئے۔ پہلے ایک دفتر میں کام کیا پھر دارالترجمہ میں بحیثیت مترجم ملازمت مل گئی۔ ۲۱/اکتوبر ۱۹۲۱ء کو حیدر آباد میں انتقال ہوگیا۔ (بیسویں صدی کے بعض لکھنوی ادیب اپنے تہذیبی پس منظر میں) [۱۳] عبدالباری ندوی، حکیم عبدالخالق کے صاحبزادے تھے۔ یکم اگست ۱۸۹۰ء کو بارہ بنکی (یو۔پی) میں ولادت ہوئی۔ ۱۹۲۲ء میں حیدر آباد ریاست میں ملازم ہوئے۔ مختلف عہدوں پر کام کیا۔ (بہ شکریہ ایم۔اے۔کے۔فاطمی صاحب) [۱۴] شروانی، حبیب الرحمٰن خاں۔ محمد تقی خاں صاحب رئیس بھیکن پور کے صاحبزادے تھے۔ ۱۸۶۶ء میں بھیکن پور میں ولادت ہوئی۔ عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ محمد تقی خاں صاحب نے زمین خرید کر بہت بڑی زمین داری قائم کی۔ اس علاقے کا نام حبیب گنج رکھا۔ جو حبیب الرحمٰن خاں کو وراثت میں ملا۔ حبیب صاحب "الندوہ" کی ادارت میں علامہ شبلی کے شریک تھے۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور انجمن ترقی اردو کے سکریٹری رہے۔ ۱۹۱۸ء میں نواب حیدر آباد نے صدر الصدور امور مذہبی کے عہدے پر فائز کیا۔ ۱۹۲۲ء میں نواب صاحب نے صدر یار جنگ کے خطاب سے نوازا۔ ۱۹۴۱ء میں مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ نے ڈاکٹر آف تھیالوجی کی اعزازی ڈگری تفویض کی۔ ۱۱/اگست ۱۹۵۰ء کو انتقال ہوا۔ [۱۵] یہ بتانا مشکل ہے کہ یہ شراونی صاحب کون ہیں۔ [۱۶] احمد حسین نام تھا۔ مدراس کے ایک تاجر محمد قاسم کے صاحبزادے تھے۔ ۱۸۶۳ء میں مدراس میں پیدا ہوئے۔ مدراس یونی ورسٹی سے ۱۸۸۵ء میں بی۔اے اور ۱۸۹۰ء میں ایم۔اے۔کیا۔ ضلع ارکاٹ صوبہ مدراس میں ۱۸۹۱ء میں ڈپٹی کلکٹر اور مجسٹریٹ کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ۱۸۹۳ء میں حیدر آباد ریاست میں ملازمت کرلی اور اعلا عہدوں پر فائز ہوئے۔ نواب حیدر آباد نے امین جنگ اور سرکار انگریزی نے "سر" کے خطابات سے نوازا۔ عثمانیہ یونی ورسٹی نے ایل۔ ایل۔ ڈی کی اعزازی ڈگری دی۔ (بہ شکریہ جناب ایم۔اے۔کے۔فاطمی) [۱۷] نیاز سے مراد نیاز فتحپوری ہے، جو اپنے بعض ہم عصروں پر ماہنامہ نگار میں جائز ناجائز اعتراضات شائع کرتے تھے۔ [۱۸] مراد ہے مولانا عبدالماجد دریابادی سے۔ نیاز صاحب خاصے عرصے تک مولانا پر اعتراضات کرتے رہے تھے۔ [۱۹] ہوش بلگرامی، ناظر الحسن۔ ۸/جون ۱۹۰۰ء کو بلگرام میں پیدا ہوئے۔ عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں پر قدرت حاصل تھی۔ کسی باقاعدہ اسکول یا کالج میں تعلیم حاصل نہیں کی۔ خود گھر پر اپنی کوشش سے علم حاصل کیا۔ حیدر آباد میں "ذخیرہ" کے مدیر رہے۔ نواب میر عثمان

علی خاں نے ان کی قابلیت سے متاثر ہو کر انھیں اپنا مصاحب بنالیا تھا۔ ۳۰؍ اکتوبر ۱۹۲۸ء کو انسپکٹر آف سیونگ بینک بلدہ حیدر آباد کے عہدے پر فائز ہوئے اور پھر ۵؍ دسمبر ۱۹۳۹ء کو افواج باقاعدہ ریاست حیدر آباد کے ڈپٹی سکریٹری مقرر ہوئے۔ ۱۹؍ دسمبر ۱۹۵۵ء کو حیدر آباد میں انتقال ہوا۔ (بہ شکریہ جناب ایم۔ اے۔ کے۔ فاطمی) ۲۰۔ جوش صاحب ۱۹۲۴ء میں حیدر آباد گئے ہیں اور ۱۹۳۴ء میں نواب حیدر آباد نے حیدر آباد سے ان کے اخراج کا فرمان جاری کیا۔ زیر نظر کتاب میں اس سلسلے کی دستاویز شامل ہیں۔ ۲۱۔ جوش "کاخ بلند" کے نام سے دہلی سے ایک ماہنامہ جاری کرنا چاہتے تھے۔ بعض دوستوں کے مشورے سے یہ رسالہ "کلیم" کے نام سے جاری ہوا۔ جوش نے یہی خط مولانا عبدالماجد دریابادی، سر راس مسعود اور بعض دوسرے حضرات کو بھیجا تھا۔ ۲۲۔ ۴؍ اپریل ۱۸۷۲ء کو سورت میں ولادت ہوئی۔ آئی۔ پی۔ ایس تھے۔ اعلا عہدوں پر فائز رہے۔ ۱۰؍ دسمبر ۱۹۵۳ء کو لندن میں انتقال ہوا۔ (تذکرہ ماہ و سال: ۲۶۷) ۲۳۔ لکھنؤ کے فرنگی محل خاندان سے تعلق تھا۔ ۱۹۲۰ء کے قریب ولادت ہوئی۔ فرنگی محل کے مدرسہ عالیہ نظامی میں حفظ قرآن کیا اور "مولوی" و مولانا کی سند حاصل کی۔ لکھنؤ یونی ورسٹی سے "عالم" اور الہ آباد یونی ورسٹی سے منشی (فارسی) اور پنجاب یونی ورسٹی سے منشی فاضل کی ڈگریاں حاصل کیں۔ ۱۹۴۷ء میں ماہنامہ "نیا ادب" کے نائب مدیر مقرر ہوئے۔ کچھ عرصے "قومی آواز" میں کام کیا۔ ۱۹۶۹ء میں مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں دینیات کے لیکچرر مقرر ہوئے۔ ۱۹۸۰ میں ریٹائر ہو گئے۔ کئی کتابوں کے مترجم، مرتب اور مصنف ہیں۔ ۵؍ فروری ۱۹۹۰ء کو لکھنؤ میں وفات پائی۔ (ارباب اردو: ۳: ۱۲۳)۔ ۲۴۔ بقول علی جواد زیدی صاحب لکھنؤ کے ایک ناشر تھے۔

شیخ منظور الٰہی:

۱۔ جوش نے خط کی تاریخ تحریر ۲۶؍ اکتوبر ۱۹۴۶ء لکھی ہے۔ یہ سنہ ۱۹۴۶ نہیں ۱۹۶۶ء ہے۔ جوش سے سہو قلم ہوا ہے۔

۲۔ جوش نے پاکستان کی گورنمنٹ کو اکیڈمی آف لیٹرز کے نام سے ایک علمی ادارے کے قیام کی تجویز پیش کی تھی۔ حکومت نے فنانس سکریٹری ممتاز حسن صاحب کے پاس یہ تجویز بھیج دی۔ وہ اہل علم اور باذوق انسان تھے۔ انھیں یہ تجویز پسند آئی اور انھوں نے ترقی اردو بورڈ کے نام سے ایک ادارہ قائم کر دیا۔ بورڈ کا کام اردو لغت تیار کرنا تھا۔ مولوی عبدالحق چیف اڈیٹر مقرر کیے گئے۔ اور لغت کی تیاری کا کام جوش کو سونپا گیا (یادوں کی برات، (دہلی، ۱۹۸۶ء): ۲۸۹۔ ۲۹۲)

۳۔ جوشؔ اور ترقی اردو بورڈ کے سکریٹری شان الحق حقی صاحب میں اختلافات ہو گئے۔ پاکستانی حکومت نے ہندوستان میں جوشؔ کے ایک انٹرویو کو بہانہ بنا کر ترقی اردو بورڈ سے ان کی ملازمت ختم کر دی۔

سجّاد ظہیر:

(۱) سجاد ظہیر صاحب کو ان کے عزیز و اقارب "بنے بھائی" کہتے تھے۔

(۲) نادم صاحب کے مختصر حالات مکتوب الیہم کے تحت لکھے گئے ہیں۔

(۳) خواجہ احمد عباس، خواجہ غلام الثقلین کے صاحبزادے تھے۔ ۷ رجون ۱۹۱۴ کو خواجہ احمد عباس پانی پت میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ اس کے بعد پانی پت کے حالی مسلم اسکول سے مڈل کا امتحان پاس کیا اور پھر اعلا تعلیم کے لیے علی گڑھ بھیج دیے گئے، جہاں انھوں نے ۱۹۳۳ء میں بی۔اے اور ۱۹۳۵ء میں وکالت کا امتحان پاس کیا۔ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ انگریزی اور اردو صحافت میں گزرا۔ خواجہ صاحب صفِ اوّل کے ناول نگار، افسانہ نگار، دانش ور، مفکر، انگریزی اور اردو کے صحافی اور اعلیٰ درجے کے فلم ساز تھے۔ یکم جون ۱۹۸۷ء کو ان کا انتقال ہوا۔ (خواجہ احمد عباس: افکار، گفتار، کردار)

اختر حسین:

۱۔سخاوت میرزا: آگرے کے رہنے والے تھے۔ ان کے دادا بعض عمائدین کی دعوت پر حیدر آباد چلے گئے۔ مختلف ملازمتیں کیں، وہیں انتقال ہوا۔ سخاوت مرزا جنوری / فروری ۱۸۹۸ء میں پیدا ہوئے۔ عثمانیہ یونی ورسٹی سے بی۔اے۔ ایل ایل بی کے امتحانات پاس کیے۔ حیدر آباد میں مختلف عہدوں پر کام کیا۔ آخری عمر میں پاکستان چلے گئے انجمن ترقی اردو (پاکستان) ترقی اردو بورڈ (کراچی) کے علاوہ اور اداروں میں بھی کام کیا۔ ان کی ۳۵ تصنیفات ہیں۔ ۲۲ر جنوری ۱۹۷۷ء کو کراچی میں ان کا انتقال ہو گیا۔ تذکرہ معاصرین: ۴: ۲۱۷۔۲۱۹) ۲۔ مشفق خواجہ کے حالات مکتوب الیہم کے تحت بیان کر دیے گئے ہیں۔ ۳۔ انجمن ترقی اردو (پاکستان)۔ (اس سفارشی خط کی بنیاد پر سخاوت صاحب کو انجمن کے دفتر میں ملازم رکھ لیا گیا تھا) ۴۔ خاور نگرامی ہومیو پیتھی کے ڈاکٹر تھے۔ "شاد عظیم آبادی ایک تحقیقی جائزہ" ۱۹۸۷ء میں شائع ہوئی۔ جون ۱۹۹۶ء میں انتقال ہوا۔ (بہ شکریہ مشفق خواجہ صاحب)۔

مشفق خواجہ:

۱۔ بھوپال میں ایک اڈووکیٹ تھے سید محمد عسکری۔ فنِ موسیقی کے ماہر تھے۔ ٹھمری اور دادرا بہت اچھا گاتے

تھے۔ ڈاکٹر عالیہ امام انہی کی صاحبزادی ہیں۔ بقول جوش "عالیہ بی بی نے اپنے باپ کی وکالت و ذہانت ورثے میں پائی ہے اور اسی کے دوش بدوش وہ سیاست میں گہری نظر رکھتی ہیں اور اسی ذوق سیاست کی وجہ سے وہ چین و روس کا بھی دورہ کر آئی ہیں" (جوش ملیح آبادی کی نادر و غیر مطبوعہ تحریریں: ص ۱۰۹)

ظفر ادیب:

[۱] جوش "تیار" کا املا "طیار" کرتے تھے۔ [۲] عرش ملسیانی کے حالات آگے لکھ دیے گئے ہیں۔ [۳] دفتر سے مراد ماہانہ آجکل کا دفتر ہے۔

جدّن بائی:

[۱] جدن بھائی اپنے زمانے کی مشہور موسیقار تھیں۔ ان کے حالات نہیں مل سکے۔ [۲] حسن جعفر جوش کے قریبی عزیز تھے [۳] ہندوستانی فلمی دنیا کی مشہور ممتاز اداکارہ تھیں۔

کنور مہندر سنگھ بیدی:

[۱] یہ مکھن لال کا ذکر ہے۔ جو پہلے چاندی کا سٹہ کیا کرتے تھے۔ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کے مشورہ سے بمبئی چلے گئے۔ وہاں سٹہ کے علاوہ فلم بھی بنانے لگے۔ انہوں نے تین بہت اچھی فلمیں بنائیں۔ "دیدار" "چھوٹی بھابھی" "گھنگھرو"۔ (یادوں کا جشن: ۲۹۱۔۲۸۷) [۲] سر شنکر لال اور مرلی دھر شاد کی کپڑوں کی ایک بہت بڑی مل لائلپور (پاکستان) میں تھی۔ یہ دونوں حضرات لائلپور میں ہر سال مشاعرہ کرتے اور موسیقی کی محفلیں سجاتے۔ تقسیم ہند کے کچھ عرصے بعد تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ پھر لائلپور میں ان حضرات کا مل بند ہو گیا۔ شنکر لال اور مرلی دھر شاد دونوں لائلپور سے ہوائی جہاز میں دہلی آرہے تھے کہ ہوائی جہاز حادثہ کا شکار ہو گیا۔ یہ دونوں خدا کو پیارے ہوگئے۔ مرلی دھر شاد کے سب سے بڑے صاحب زادے سری رام تھے۔ انھوں نے بزرگوں کی یاد میں انڈو پاک شنکر لال مرلی دھر شاد مشاعرہ شروع کیا جواب بھی ہر سال پابندی سے منعقد ہوتا ہے۔ مرلی دھر شاد کا مجموعہ کلام "گل و انجم" دہلی سے ۱۹۵۰ء میں شائع ہوا تھا (بہ شکریہ گلزار دہلوی صاحب) [۳] جوش کے دوست تھے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ حکومت پاکستان نے انھیں جوش کی جاسوسی پر لگا رکھا تھا۔ [۴] مودیا شنکر: آئی۔ سی۔ ایس تھے اور دہلی کے چیف کمشنر شنکر پرشاد سے ایک سال جونیر تھے۔ اردو شاعری اور موسیقی کے دلدادہ تھے۔ تقسیم ہند کے بعد سردار پٹیل کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ ذہن

سکریٹری کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ اس کے بعد جب مرارجی ڈیسائی پرائم منسٹر ہوئے تو انہوں نے وِدّیا شنکر کو اپنا سکریٹری مقرر کیا۔ چودھری چرن سنگھ پرائم منسٹر بنے تو انہوں نے بھی انہیں اپنا پرسنل سکریٹری بنایا۔ مشاعروں اور ادبی محفلوں میں اکثر شریک ہوتے۔ (یادوں کا جشن: ۲۲۳۔۳۲۱)

شنکر پرشاد:

لہ ۲۔ جوش کے چھوٹے بھائی رئیس احمد خاں ۳۔ جوش کے صاحبزادے سجاد حیدر ۴۔ جوش کی صاحبزادی سعیدہ خاتون ۵۔ ایس۔ کے۔ سکسینہ، جوش کے بہت عزیز دوست دہلی یونی ورسٹی کے ہندو کالج میں فلسفے کے شعبے کے صدر تھے۔ بعد میں مرکزی حکومت کے محکمہ اطلاعات میں ڈپٹی ڈائرکٹر ہو گئے۔ دل چسپ انسان تھے۔ جوش نے "یادوں کی برات" (ص ص ۴۵۱۔۴۵۷) میں ان کے کچھ دلچسپ واقعات لکھے ہیں۔ ۶۔ بسمل سعیدی، سید عیسیٰ۔ ۶/ جنوری ۱۹۰۲ء کو ٹونک میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام مولوی سعید احمد تھا۔ گھر پر مشرقی تعلیم حاصل کی اور چھٹی کلاس تک اسکول میں پڑھا۔ طب کی کتابوں کا باقاعدہ مطالعہ کیا۔ بسمل صاحب کے کلام کے چار مجموعے، "نشاطِ غم"، "کیفِ غم"، "اوراقِ زندگی" اور "مشاہدات" شائع ہوئے۔ بخشی غلام محمد بسمل سعیدی مرحوم کو کسٹوڈین کا وہ مکان دلوانا چاہتے تھے، جس میں بسمل صاحب کی رہائش تھی۔ اس سلسلے میں ایک سرٹیفکٹ دینا تھا کہ بسمل تین سال سے اس مکان میں رہتے ہیں۔ شنکر لال صاحب نے یہ سرٹیفکٹ دیا تھا۔ ۲۶/ اگست ۱۹۷۷ء کو بسمل صاحب کا دہلی میں انتقال ہوا۔ (تذکرہ معاصرین ۴: ۳۰۱۔۳۰۴) ۷۔ ہری چند اختر، ۱۵/ اپریل ۱۹۰۰ء کو صاحبا (ضلع ہوشیار پور) میں ولادت ہوئی۔ لاہور سے فارسی میں ایم۔ اے کیا۔ شاعری میں حفیظ جالندھری کے شاگرد تھے۔ دہلی کی ادبی محفلوں کی جان تھے۔ بہت شگفتہ مزاج تھے۔ بہت خوددار اور غیور۔ اگرچہ زندگی خاصی عسرت میں گزری، لیکن کبھی کسی کے آگے دستِ سوال دراز نہیں کیا۔ یکم جنوری ۱۹۵۸ء کو دہلی میں بعارضہ قلب انتقال کیا۔ (تذکرہ ماہ و سال ۲۷۔ یادوں کا جشن: ۲۴۳۔۲۴۸) ۸۔ راجندر ناتھ شیدا، اردو کے ترقی پسند نامور نقاد تھے۔ مارچ ۱۹۱۶ء میں مظفر نگر میں پیدا ہوئے۔ دہلی یونی ورسٹی کے ہندو کالج میں طویل عرصے تک فلسفے کے لیکچرر رہے۔ بعد میں دہلی اسٹیٹ پریس آفیسر مقرر ہوئے۔ کئی کتابوں کے مصنف تھے، جن میں "ادب و روایت" کو اپنے زمانے میں بہت شہرت حاصل ہوئی۔ (تذکرۂ ماہ و سال: ص ۲۳۲ کچھ معلومات پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے فراہم کیں) ۹۔ التفات احمد شہاب، ملیح آباد میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام نبی احمد تھا۔ جوش

کی بنی سعیدہ خاتون کے شوہر تھے۔ ۱۹۲۶ء میں شادی ہوئی۔ جوش کی چچازاد بہن کے صاحبزادے تھے۔ دہلی میں دہلی کالج (آج کل ذاکر حسین کالج) میں لیکچرر رہے تھے۔ ۵۴ سال کی عمر میں ۴/اپریل ۱۹۶۷ء کو انتقال ہوا۔ (بہ شکریہ ڈاکٹر ہلال نقوی) [۱۰] کچھ سال پہلے دہلی کالج کا نام بدل کر ذاکر حسین کالج کر دیا گیا۔ [۱۱] جوش نے پنڈت نہرو کا یہ واقعہ "یادوں کی برات" (ص ص ۵۱۹۔ ۵۲۰) میں بھی بیان کیا ہے۔ [۱۲] یہ ماہانہ رسالہ تھا۔ اس کے لیٹر ہیڈ پر عہدے داروں کے نام اس طرح چھپے ہوئے تھے۔

سرپرست	:جوش آبادی
مدیران	:سجاد حید رملیح آبادی، اظہار ملیح آبادی، بیگم حمیدہ سلطان (مدیرہ)
پبلسٹی انچارج	:سرداری لال کھوسلہ، نورچرن منیجر
پتا	:ڈی۔ ا، پریس بلاک روڈ، سول لائن، اولڈ سیکریٹریٹ، دہلی

[۱۳] سر شنکر لال۔ دہلی کلاتھ مل کے مالک تھے۔ بقول کنور مہندر سنگھ بیدی ارب پتی تھے۔ شعر گوئی کا ذوق تھا۔ اس فن میں بیخود دہلوی کے شاگرد تھے۔ موسیقی کے رسیا تھے۔ کنور مہندر سنگھ بیدی نے "یادوں کا جشن" میں ان کا مختصر لیکن بہت دل چسپ خاکہ لکھا ہے۔ [۱۴] عرش ملسیانی، بال مکند، جوش ملسیانی کے صاحبزادے تھے۔ ۲۰/ستمبر ۱۹۰۸ء کو قصبہ ملسیان ضلع جالندھر میں پیدا ہوئے۔ عرش صاحب کے والد جوش ملسیانی بہت مشہور و ممتاز شاعر تھے۔ بی۔ اے تک تعلیم حاصل کی۔ ان کی پہلی ملازمت محکمہ نہر میں تھی۔ اس کے بعد وہ ایک اسکول میں استاد ہو گئے۔ چودہ پندرہ سال اس ادارے میں کام کیا اور سرکاری ملازمت میں آگئے اور ۱۹۴۷ء کے بعد ماہنامہ "آج کل" میں ملازمت کرلی اور ریٹائر ہونے تک یہیں کام کرتے رہے۔ ۲۵/ستمبر ۱۹۷۹ء کو دہلی میں انتقال ہوا۔ (جدید شعرائے اردو) [۱۵] راجا غضنفر علی خاں آزادی کے بعد ہندوستان میں پاکستان کے ہائی کمشنر بن کر آئے تھے۔ [۱۶] اظہار ملیح آبادی۔ شاعر، صحافی، جوش ملیح آبادی کے بھانجے تھے۔ ۴۲ سال کی عمر میں ۱۹۶۸۔۱۲۔ا کو کراچی میں انتقال ہوا۔ (وفیات مشاہیر پاکستان، ص ۲۲)

رام پرکاش ساحر ہوشیار پوری:

[۱] کنور مہندر سنگھ بیدی سحر۔ [۲] جب حیدر آباد سے جوش کا اخراج ہو گیا تو وہ لکھنؤ واپس آگئے۔ کچھ دن بعد سرتیج بہادر سپرو کی سفارش پر مہاراجا پٹیالہ نے جوش کا ڈھائی سو روپے ماہوار تاحیات وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔

یہ اسی وظیفے کا ذکر ہے۔ [۳] کنور مہندر سنگھ بیدی سحر۔ [۴] ساحر ہوشیارپوری نے کانپور میں ایک مکتبہ قائم کیا تھا۔ وہ اس مکتبے سے جوش کا مجموعہ کلام شائع کرنا چاہتے تھے۔ یہ اقرار نامہ اسی مجموعے کا ہے۔ ساحر نے تین ہزار روپے پیشگی ادا کر دیے تھے، لیکن کسی وجہ سے یہ مجموعہ اس مکتبے سے شائع نہیں ہوا۔ یہ اقرار نامہ انجمن ترقی اردو کے آرکائوز میں محفوظ ہے۔ [۵] شیو راج بہادر دہلی والے اور راج نارائن کے صاحبزادے تھے۔ ایک

فائنینس کمپنی کے مالک تھے۔ شعر و شاعری اور موسیقی کا بہت اچھا ذوق تھا۔ غالب کے عاشق تھے اور بقول کنور مہندر سنگھ بیدی انھیں غالب کا تقریباً پورا دیوان حفظ تھا۔ دمے کی دائمی مریض تھے۔ ۱۹۵۷ء میں انتقال ہوا۔ (یادوں کا جشن: ص ص ۲۹۴۔۲۹۷) [۶] جوش کے صاحبزادے سجاد حیدر۔ [۷] یہ پہلے جشن

جمہوریت کا ذکر ہے۔ جو ۲۷، ۲۸ر فروری اور یکم و ۲ر مارچ ۱۹۵۰ کو منعقد ہوا تھا۔ سر شنکر لال استقبالیہ کمیٹی کے صدر تھے اور شنکر پرشاد ایگزیکٹیو کمیٹی کے صدر۔ اس تقریب کے چار سکریٹریز تھے۔ (۱) کنور مہندر سنگھ بیدی سحر (۲) بیگم حمیدہ سلطان (۳) ساحر ہوشیارپوری (۴) گلزار دہلوی۔

اس تقریب کی ایگزیکٹیو کمیٹی بھی بنائی گئی تھی۔ جس کے اراکین میں شیو راج بہادر، پی۔ این دھر اور کشن لال بھی شامل تھے۔ سجاد حیدر کو موسیقی کے پروگرام کا انچارج بنایا گیا تھا۔ سجاد اور روی شنکر کے کچھ اختلاف ہو گئے اور سجاد سے یہ پروگرام واپس لے لیا گیا۔ [۸] بسمل صاحب کے حالات شنکر پرشاد کے نام خطوط کے

حواشی میں بیان کیے گئے ہیں۔ دہلی میں ایک خاتون تھیں۔ بہت خوبصورت اور بہت فیاض۔ لیکن صرف دولت مندوں یا صاحب اقتدار لوگوں کی ان تک رسائی تھی، بسمل سعیدی صاحب بھی ان کے عاشق تھے، لیکن نہ دولت نہ اقتدار اس لیے ان خاتون کی توجہ سے محروم رہتے تھے۔ ایک دفعہ کچھ دوستوں نے خاتون کو وصل پر راضی کر لیا۔ بسمل صاحب نے ایک رات ان کے ساتھ گزاری۔ اسی واقعے کی طرف اشارہ ہے۔ یہ خاتون اب بھی حیات ہیں۔ مفلسی اور غربت نے عبرت کا نمونہ بنا رکھا ہے۔ [9] پاکستان کے ذوالفقار علی بھٹو

سے مراد ہے۔ [۱۰] دہلی پولس میں سپاہی تھے۔ عرصے تک کنور مہندر سنگھ بیدی کے سیکورٹی گارڈ رہے، لمبی داڑھی تھی۔ خدائی فوجدار ہونے کی حد تک کٹر مذہبی آدمی تھے۔ شراب کے سخت مخالف تھے۔ اگر مشاعرے میں جوش ہوتے تو ان کی طرف اشارے کر کر کے شراب کے خلاف اشعار پڑھتے تھے۔

سعیدہ خاتون:

[۱] جوش نے اپنی بیٹی، ان کی اولاد اور بیٹے سجاد حیدر کی اولاد کے پیار کے نام رکھے ہوئے تھے۔ کلوا، سعیدہ

خاتون کو کہتے تھے۔ ۲جوش کی بیوی ۳اصل نام فرخ جمال جوش کے نواسے ۴اصل نام سراج انور خاں، جوش کے نواسے ۵صبوحی خاتون۔ ۶انور سعید خاں، جوش کے بڑے نواسے ۷خسرو شہاب خاں، جوش کے نواسے ۸سجاد حیدر نے بہت زیادہ شراب پی کر صحت خراب کر لی تھی ۹جوش کے چھوٹے بھائی ۱۰ جوش کی نواسی غزالہ خاتون کا بڑا بیٹا ۱۱علی معظم خاں، جوش کے نواسے ۱۲جوش کے نواسے حیدر مسعود خاں ۱۳جوش کی بڑی نواسی صبوحی خاتون ۱۴جوش کی نواسی غزالہ خاتون ۱۵جوش کی پوتی، تبسم خاتون، ۱۶حسن ناصر خاں، جوش کی نواسی کے شوہر ۱۷انور محمد، جوش کی چھوٹی نواسی کے شوہر۔

منظر صدیقی:

۱ ۱۸۸۰ء میں آگرے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مولانا محمد حسین صدیقی اجمیر میں "ٹائمس آف انڈیا" پریس کی شاخ کے نگراں تھے۔ سیماب صاحب نے عربی اور فارسی میں غیر معمولی دستگاہ بہم پہنچائی تھی۔ کالج میں داخلہ لیا۔ ایف۔ اے کا دوسرا سال تھا جب والد کا انتقال ہو گیا۔ انھیں مجبوراً ریلوے کے محکمہ میں ملازمت کرلی پڑی۔ سیماب صاحب، داغ کے شاگردوں میں تھے۔ انہوں نے کچھ ہی عرصہ ملازمت کی اور پھر ساری زندگی ادبی صحافت اور تصنیفات و تالیفات میں گزاری۔ ان کی تصنیفات کی فہرست بہت طویل ہے اردو کے صف اول کے شاعر اور نثر نگار تھے۔ سینکڑوں کی تعداد میں ان کے شاگرد تھے۔ ۳۱ر دسمبر ۱۹۵۱ء کو کراچی میں ان کا انتقال ہو گیا۔ (عبدالوحید، جدید شعرائے اردو، لاہور۔ ضیا فتح آبادی، (ذکر سیماب، دہلی، ۱۹۸۴ء)

راس مسعود:

۱جوش ۱۹۳۴ء میں نظام کے حکم سے حیدر آباد سے شہر بدر کر دیے گئے تھے۔ اس واقعے کی تفصیل جوش نے "یادوں کی برات" میں بیان کی ہے۔ اسی واقعے کی طرف اشارہ ہے۔ ۲یہ خط دراصل ایک سرکولر تھا، جو کئی لوگوں کو بھیجا گیا تھا۔ ۳جوش دہلی سے ایک ماہنامہ جاری کرنا چاہتے تھے، انھوں نے اس ماہنامے کا نام "کاخ بلند" طے کیا تھا۔ لیکن بعض دوستوں کے مشورے پر یہ نام بدل کر "کلیم" کر دیا۔ ۴ملا رموزی: اصل نام محمد صدیق رشاد تھا۔ ۲۱ر مئی ۱۸۹۶ء کو بھوپال میں پیدا ہوئے۔ اسی شہر میں مشرقی تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۱۷ء میں ادبی زندگی کا آغاز ہوا۔ ۳۹ کتابوں کے مصنف تھے۔ ۱۰ر جنوری ۱۹۵۲ء کو انتقال ہو گیا۔ (مدھیہ پردیش اردو

اکادمی کی سہ روزہ تقریبات کے موقع پر اردو ہندی میں "یادِ ملا رموزی" کے نام سے ایک چھوٹا سا پمفلٹ شائع ہوا تھا۔ یہ معلومات اسی پمفلٹ سے لی گئی ہیں۔ [۵] سر تیج بہادر سپرو۔ ۸/ دسمبر ۱۸۷۵ء کو علی گڑھ میں پیدا ہوئے۔ ان کا شمار صفِ اول کے مجاہدین میں ہوتا ہے۔ اردو کے عاشق تھے۔ انجمن ترقی اردو (ہند) کے صدر رہے تھے۔ اور بھی کئی اردو تنظیموں سے وابستہ تھے۔ ۲۰/ جنوری ۱۹۵۹ء کو اُن کا انتقال ہو گیا۔ [۶] سروجنی نائیڈو۔ مشرقی بنگال کے ایک گاؤں میں برہم نگر کے رہنے والے اگھور ناتھ چٹوپادھیائے کی صاحبزادی تھیں۔ ۱۳/ فروری ۱۸۷۹ء کو پیدا ہوئیں۔ مدراس سے میٹرک پاس کیا۔ تیرہ سال کی عمر میں شاعری شروع کی۔ ۱۸۹۵ء میں اعلا تعلیم کے لیے انگلینڈ گئیں۔ ۱۸۹۸ء میں ہندوستان واپس آئیں تو ان کی شادی ڈاکٹر نائیڈو سے ہو گئی۔ کچھ عرصے بعد ہندوستان کی جنگ آزادی میں شریک ہو گئیں۔ ہندوستان آزاد ہونے پر اتر پردیش کی پہلی گورنر مقرر ہوئیں۔ ۲/ مارچ ۱۹۴۹ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔ (سروجنی نائیڈو) [۷] اکبر حیدری: پورا نام اکبر نذر علی حیدری۔ بمبئی میں ۸/ نومبر ۱۸۶۹ء کو پیدا ہوئے۔ بمبئی سے بی۔ اے کیا۔ برطانوی حکومت کے مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ ۱۹۱۱ء میں حیدر آباد میں ملازم ہو کر آ گئے۔ مولوی عبدالحق نے اکبر حیدری کو جامعہ عثمانیہ کے قیام کے لیے راضی کر لیا۔ اکبر حیدری کو میر عثمان علی خاں کے مزاج میں بہت دخل تھا۔ انھوں نے میر عثمان سے اس انداز سے درخواست کی کہ وہ راضی ہو گئے۔ دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کا قیام بھی انھی کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ ۱۹۴۵ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ (بہ شکریہ ایم۔ اے۔ کے۔ فاطمی صاحب) [۸] میرا خیال ہے کہ سات جلدوں میں جوش کا کلام کبھی مرتب نہیں ہوا، یہ محض حسن طلب ہے۔ [۹] یہ اعلان راغب مراد آبادی کے مرتبہ خطوط جوش ملیح آبادی میں بھی شامل ہے۔

خورشید علی خاں:

۱۔ قدرت اللہ شہاب۔ مشہور مصنف تھے۔ آئی۔ سی۔ ایس تھے۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان کی سول سروس میں رہے۔ پاکستان کے مشہور ادبی ادارے پاکستان رائٹرز گلڈ کے بانی تھے۔ انجمن ترقی اردو (پاکستان) کے صدر رہے۔ کئی کتابوں کے مصنف تھے، جن میں "شہاب نامہ" کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ عرصہ ہوا انتقال ہو گیا۔ (بہ شکریہ مشفق خواجہ صاحب)

۲۔ خورشید صاحب کے چھوٹے بھائی نعمت اللہ خاں۔ یہ بھی جوش کے عقیدت مند تھے۔

۳۔ سلامت اللہ خاں جوش کے ایک دوست تھے۔

۴۔ جوش کی بہن کے داماد ہاشمی صاحب کی تین صاحب زادیاں تھیں۔ ریحانہ، رخسانہ اور فرزانہ۔ رخسانہ

لاہور میں رہتی تھیں۔ ’’ہماری جوش صاحب‘‘ میں ان تینوں بہن کا ذکر ہے۔

۵۔ خورشید صاحب کا بیان ہے کہ یہ محض مذاق ہے۔ حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ملاحظہ ہو ’’ہمارے جوش صاحب‘‘ (ص ص ۲۷۷۔۲۷۸)

۶۔ جوش کے چھوٹے بھائی رئیس احمد خاں اور خورشید علی خاں کے چھوٹے بھائی نعمت اللہ خاں۔ نعمت دل کے مریض تھے۔ پولس افسر ہونے کی وجہ سے بہت مصروف رہتے تھے۔ آرام نہ کرنے کی وجہ سے ۳۰ راکتوبر ۱۹۷۲ء کو ان کو دل کا دورہ پڑا۔ اسپتال میں داخل کر دیے گئے۔ جہاں ۵ رنومبر ۱۹۷۲ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔

۷۔ ’’مکمل وجرس‘‘ یہ مجموعہ میری نظر سے نہیں گزرا ممکن ہے یہ وہی مجموعہ ہو جو ’’محراب و مضراب‘‘ کے نام سے شائع ہوا ہے۔

۸۔ ’’فتنہ آخرالزماں‘‘ جوش اپنی آخری محبوبہ کو ’’فتنہ آخرالزماں‘‘ کہا کرتے تھے۔ اس محبوبہ کی عمر اٹھارہ انیس سال تھی اور اس کا فرضی نام سمن تھا۔ اس کے حالات قدرے تفصیل سے پیش لفظ میں بیان کر دیے گئے ہیں۔

۹۔ سمن کی ایک بڑی بہن بھی تھی۔ یہ ان دونوں بہنوں کا ذکر ہے۔

۱۰۔ کوثر نیازی کا پورا نام حیات محمد خاں تھا۔ ۱۹۳۴ء میں پیدا ہوئے شاعر، ادیب اور صحافی تھے۔ بہت اچھے مقرر تھے۔ ممتاز سیاست دانوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو کے زمانے میں وفاقی وزیر تھے۔ ۲۹ رمارچ ۱۹۹۴ء کو وفات پائی۔ (بہ شکریہ مشفق خواجہ صاحب)

۱۱۔ جوش اپنی بیگم کو ’’ام الشعرا‘‘ کہا کرتے تھے۔

۱۲۔ راغب مرادآبادی، اصغر حسین: ۲۷ رمارچ ۱۹۱۸ء کو مرادآباد میں پیدا ہوئے۔ بی۔ اے۔ تک تعلیم پائی۔ اس کے علاوہ ادیب فاضل (اردو) منشی فاضل (فارسی) کے امتحانات پاس کیے اور طبیہ کالج سے فارغ التحصیل ہوئے۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان چلے گئے۔ وہاں کئی سرکاری ملازمتیں کیں۔ پچیس مجموعہ کلام شائع ہوئے۔ ’’مکالمات جوش و راغب‘‘ ان کی اہم کتاب ہے۔ ’’خطوط جوش ملیح آبادی‘‘ کے نام سے انھوں نے جوش کے خطوط مرتب کر کے شائع کیے ہیں۔ آج کل کراچی میں مقیم ہیں۔ (رگ گفتار: ۳۶۸۔۳۶۴)

۱۳۔ شفیع الحق۔ اسٹیٹ لائف انشورنس کمپنی میں خازن کے عہدے پر فائز تھے۔ انھوں نے جوش کی ’’یادوں کی برات‘‘ کی طباعت میں اعانت کی تھی۔ جوش صاحب کو بھیم جی جو ماہانہ رقم دیتے تھے وہ شفیع

صاحب ہی ادا کرتے تھے (بہ شکریہ خورشید علی خاں)

۱۴ عابد صاحب جوش کے دور کے عزیز تھے۔ جوش کی کلیرنگ اینڈ فارورڈنگ کی ایجنسی عابد صاحب ہی چلاتے تھے۔ جوش کے اسلام آباد منتقل ہونے پر عابد صاحب نے یہ ایجنسی خریدی۔ (بہ شکریہ خورشید علی خاں)

۱۵۔ یوسفی سے مراد مشتاق احمد یوسفی ہے۔ آبائی وطن جے پور ہے۔ ٹونک میں ۴/ اگست ۱۹۲۳ء کو پیدا ہوئے۔ قبیلہ یوسف زئی پٹھان سے تعلق ہے۔ ۱۹۴۵ء میں علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے فلسفے میں ایم۔اے کیا۔ بنک میں ملازمت کی۔ پاکستان بنکنگ کونسل کے چیرمین کے عہدے سے ریٹائر ہو کر لندن چلے گئے۔ وہاں بی۔ سی۔ سی۔ آئی کے اڈوائزر رہے۔ اب کراچی میں مقیم ہیں۔ ہمارے زمانے کے سب سے بڑے طنز و مزاح نگار ہیں۔ چار کتابوں چراغ تلے، خاکم بدہن، زرگزشت اور آب گم کے مصنف ہیں۔ (بہ شکریہ مشفق خواجہ صاحب)

ہلال نقوی:

اہلال نقوی نے پی۔ایچ۔ڈی کے لیے "بیسویں صدی" اور جدید مرثیہ" کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھا تھا۔ یہ اسی مقالے کا ذکر ہے۔ ۲ ہلال نقوی نے اپنی شادی کے موقع پر جوش سے سہرے کی فرمائش کی تھی۔ ۳ نسرین صاحبہ سے ہلال کی شادی مئی ۱۹۷۹ء میں ہوئی۔ اب ان کے دو بچے ہیں۔ ۴ ترقی اردو بورڈ ۵

سید قاسم رضا نسیم امروہوی امروہے کے برجیس حسن کے صاحبزادے تھے۔ ۲۷/ اگست ۱۹۰۸ء کو پیدا ہوئے۔ نسیم محقق، نقاد، صحافی، ڈراما نگار، مترجم اور ماہر لغت تھے۔ مرثیہ نگاری میں بہت شہرت حاصل کی۔ ہلال نقوی نے ان کے ۲۰۹ مرثیے مرتب کر کے ۱۹۹۱ء میں شائع کر دیے ہیں۔ ۲۸/ فروری ۱۹۸۷ء کو کراچی میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ۶ پروفیسر مجتبیٰ حسین ۱۹۲۳ء میں جون پور میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان چلے گئے۔ فراق گورکھپوری کے شاگرد تھے۔ ۱۹۶۳ء میں سراج الدولہ کالج کراچی میں لیکچرر ہوئے۔ ۱۹۷۲ء میں اسی کالج کے پرنسپل ہو گئے۔ اس زمانے میں جامعہ بلوچستان کے شعبۂ اردو کے صدر ہو گئے۔ آخر عمر تک اس جامعہ سے وابستہ رہے۔ لاہور میں یکم اپریل ۱۹۸۹ء کو ہوائی اڈے جاتے ہوئے کار کا ایکسیڈنٹ ہوا اور موقع ہی پر ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے تنقیدی مضامین کے تین مجموعے ادب و آگہی، تہذیب و تحریر اور نیم رخ شائع ہوئے تھے۔ (بہ شکریہ ڈاکٹر ہلال نقوی) ۷ منظور حسین شور ملیگ صاحبزادے تھے ضامن علی کے

۱۵/ دسمبر ۱۹۱۲ء امراوتی (ناگپور) میں پیدا ہوئے۔ اردو، فارسی اور انگریزی میں ایم۔اے تھے۔ دس سال تک

ناگپور یونی ورسٹی، دو سال عثمانیہ یونی ورسٹی میں لیکچرر رہے، پھر پاکستان چلے گئے۔ سترہ سال گورنمنٹ کالج" فیصل آباد میں اور بارہ سال کراچی یونی ورسٹی میں استاد رہے۔ ان کی چھ کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ ۸ر جولائی ۱۹۹۴ء میں کراچی میں انتقال ہوا۔ (بہ شکریہ ہلال نقوی صاحب) [۸] جمیل مظہری نے ایک قطعہ کہا تھا۔ جس میں جوش سے شکایت کی گئی تھی۔ قطعہ یہ ہے:۔

سلام اے جوش یارِ ہم زباں کی اتنی ناقدری
سلام اے جوش اپنے مدح خواں کی اتنی ناقدری
بھلایا نام اس کا اپنی یادوں کی براتوں میں
جمیل مظہری سے قدرداں کی اتنی ناقدری

(جوش ملیح آبادی کی نادر وغیر مطبوعہ تحریریں (جلد اول: ۷-۱۱۳) [۹] جمیل مظہری کا بھیکن پور (بہار) میں ۲۳ر جولائی ۱۹۷۹ء کو انتقال ہوا۔ [۱۰] سید عظیم حیدر عظیم امروہوی صاحبزادے تھے نورالحسن کے۔ ۲۹ر اپریل ۱۹۴۵ کو امروہہ میں پیدا ہوئے۔ مرثیہ نگاروں میں ممتاز حیثیت کے مالک تھے۔ (بہ شکریہ ڈاکٹر ہلال نقوی)

سیدہ اختر:

[۱] جوش کے چھوٹے بھائی رئیس احمد خاں [۲] سیدہ اختر کے شوہر خان بہادر عبدالمغنی خاں [۳] سیدہ اختر کے ایک خط (مطبوعہ شان ہند دہلی، ۱ر اپریل ۱۹۷۴ء ص ۱۱) سے پتا چلتا ہے کہ انھوں نے جوش کو بنگلور بلا کر پورے تیس ہزار روپے دے دیے تھے۔ [۴] احمد صاحب کا پورا نام ڈبلیو زیڈ احمد تھا۔ پونا میں ان کی شالیمار پکچرز کے نام سے ایک کمپنی تھی۔ ۱۹۴۳ء میں جوش اور ساغر نظامی نے اس کمپنی میں ملازمت کرلی۔ ۱۹۴۷ء میں احمد پاکستان چلے گئے۔ اور جوش کی ملازمت ختم ہوگئی۔ ساغر کافی عرصے پہلے استعفیٰ دے چکے تھے۔ اس کی تفصیل میں نے "ساغر بہ نام جوش" کے مقدمے میں بیان کی ہے۔ [۵] سیدہ اختر کی حیثیت جوش کے سرپرست کی تھی۔ بقول ساغر نظامی سیدہ اختر جوش کی مالی ضروریات پوری کرتی رہتی تھیں۔ کچھ عرصے بعد جوش نے سیدہ سے عشق کی پینگیں بڑھانی شروع کردیں۔ سیدہ نے جوش کے خلاف مہذب انداز میں خط لکھے۔ جوش صاحب کے نام سیدہ کے چھ خطوط شان ہند (دہلی، اپریل ۱۹۷۴ء) میں شائع ہوئے تھے۔ انجمن کے آرکائوز میں یہ خطوط محفوظ ہیں۔

دل شاہجہاں پوری:

۱۔ دل شاہجہاں پوری کا مجموعہ کلام

۲۔ نیاز فتح پوری

۳۔ ماہانہ ''کلیم''

حکیم جمیل خاں:

۱۔ '' حامل رقعہ سے مراد حکیم محمد امام امامی ہے۔ ایک زمانے میں امامی مالی اعتبار سے بہت پریشان تھے۔ انھوں نے دیکھا کہ ''میرا وظیفہ ریاست میسور نے دوران طالب علمی میں جو جاری کیا تھا۔ وہ دلی میں سات آٹھ ماہ گزرنے پر بھی نہ ملا تھا'' اس لیے جوش نے حکیم جمیل خاں کو سفارشی خط لکھا تھا۔ (نقوش تاثرات) حکیم محمد امام امامی بنگلور کے رہنے والے ہیں۔ یہ مولوی عبدالحق کے قریبی دوستوں میں تھے۔ ابھی تک حیات ہیں۔ اگر چہ بہت ضعف ہوگئے ہیں۔ بنگلور میں مقیم ہیں۔ انھوں نے ۱۹۴۱ء میں میسور میں انجمن ترقی اردو کی شاخ قائم کی تھی۔ اس
شاخ نے طویل عرصے تک اردو کی خدمت کی۔

جوش اور حیدر آباد کے بارے میں دستاویزات

۱۔ حیدر آباد میں جوش کی ملازمت اور اخراج حیدر آباد جوش کی زندگی کا اہم حصہ ہے۔ حیدر آباد میں ملازمت حاصل کرنے، وہاں دس سال قیام اور پھر نواب میر عثمان علی خاں کو ناراض کرنے اور حیدر آباد سے نکالے جانے کے واقعات جوش نے اپنی خودنوشت ''یادوں کی برات'' میں مختصر طور پر بیان کیے ہیں لیکن اپنی خودداری، انا، عزت اور آبرو کی حفاظت کی کوشش میں بہت سے ایسی باتیں کہی ہیں، جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے بعض حقائق چھپائے ہیں اور بعض واقعات کے بیان میں مبالغہ آمیزی کی ہے۔ ڈاکٹر سید داؤد اشرف نے آندھرا پردیش اسٹیٹ کا آرکائوز سے ایسی دستاویزات ڈھونڈ نکالی ہیں، جو جوش کے قیام اور اخراجِ حیدر آباد کے سلسلے میں میں غیر معمولی اہمیت کی حامل ہیں۔ یہ سب دستاویز داؤد صاحب کی مرتبہ کتاب ''بیرونی مشاہیر ادب'' میں شامل ہیں جہاں سے زیر نظر کتاب کے متن میں شامل کی گئی ہیں۔ جوش کا بیان ہے کہ انھوں نے آنحضرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا۔

آنحضرت نے جوشؔ کو ہدایت فرمائی کہ تم نظامِ دکن کے پاس حیدر آباد چلے جاؤ، تمھیں دس سال ان کے زیر سایہ رہنا ہے (یادوں کی برات: ۲۰۱۔۲۰۶) جوشؔ ۱۹۲۴ء کے اوائل میں حیدر آباد پہنچے۔ وہ مہاراجہ سر کشن پرشاد شادؔ کے نام علامہ اقبالؔ، مولانا عبدالماجد دریابادی، اکبر آبادی اور مولانا سید سلیمان ندوی کے سفارشی خطوط لے کر گئے تھے۔ حیدر آباد پہنچتے ہی جوشؔ مہاراجا سے ملے۔ جوشؔ کی بد نصیبی کہ مہاراجا ان دنوں معتوب تھے۔ انھوں نے جوشؔ کے پیش کیے ہوئے تمام سفارشی خطوط پڑھ کر سر اکبر حیدری کے نام ایک سفارشی خط لکھا، جو جوشؔ نے ''شوکت عثانی'' میں اور مائلؔ ملیح آبادی نے ''جوش اور دیارِ دکن'' میں نقل کیا ہے۔ سر راس مسعود جوشؔ کو سر اکبر حیدری کے پاس لے گئے، لیکن بات نہیں بنی۔ نواب مہدی یار جنگ، جوشؔ کو اپنے والد عماد الملک کے پاس لے گئے۔ عماد الملک نے زوردار الفاظ میں نواب میر عثمان علی خاں سے جوشؔ کی سفارش کی۔ نواب صاحب کے دربار میں جوشؔ کی باریابی ہوگئی۔ جوشؔ نے پہلی یا دوسری حاضری کے وقت نواب کی مدح میں ۷۳ شعار کی جو نظم پڑھی تھی، اس کا عنوان تھا، ''فقیر کی صدا'' جوشؔ نے اس نظم کا نہ کبھی ذکر کیا اور نہ کہیں چھپوائی۔ پہلی بار یہ نظم مائل ملیح آبادی نے ''جوش اور دیارِ دکن'' میں نقل کی ہے۔ بقول مائل ملیح آبادی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ جوشؔ نے یہ نظم نواب صاحب کو سنائی تھی یا صرف لکھ کر پیش کی تھی۔ یہ نظم ''شوکت عثانی'' میں شامل ہے۔ ''شوکت عثانی'' میں نظم طباطبائی اور عماد الملک کے وہ تبصرے بھی شامل ہیں، جن میں جوشؔ کی ادبی خدمات کا اعتراف کیا گیا ہے۔ جوشؔ ''شوکت عثانی'' کے نام سے شاہنامے کے انداز پر دکن کی تاریخ منظوم کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے نمونے کے طور پر آصف جاہ اول اور مرہٹہ باجی راؤ کی جنگ کا منظر نظم کر کے ''شوکتِ عثانی'' میں شامل کیا ہے۔ مائل ملیح آبادی کو شوکت عثانی کا وہ نسخہ ملا ہے، جو کسی کاتب سے خوشخط لکھوایا گیا تھا۔ مائل صاحب کا یہ خیال درست معلوم ہوتا ہے ''شوکتِ عثانی'' کے کئی نسخے کتابت کرائے گئے ہوں گے۔ عرض داشت اور دوسرے نمبر پر ''فقیر کی صدا'' ہے زیر نظر کتاب کے متن میں یہ عرض داشت اور ''فقیر کی صدا'' بھی شامل کی گئی ہیں۔ اس عرض داشت کے بارے میں مائل نے لکھا ہے کہ نواب کی خدمت میں جوش نے یہ درخواست ''پہلے دن اپنی نظم ''فقیر کی صدا'' سنانے کے بعد پیش کی ہوگی یا پیش کرنا چاہتے ہوں گے۔'' شوکت عثانی میں جوشؔ کی دو اور نظمیں ''گزارشِ احوال واقعی'' اور بیداری قلم'' بھی شامل ہیں۔ جوشؔ اور حیدر آباد کے سلسلے میں مائل ملیح آبادی کی کتاب جوش اور دیارِ دکن کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔

اب آندھرا پردیش اسٹیٹ آرکائوز کی روشنی میں حیدر آباد میں جوشؔ کی ملازمت کی داستان سنیے۔ اس سلسلے کا پہلا خط انگریزی میں سر اکبر حیدری کا ہے، جو انھوں نے ۱۲ر مئی ۱۹۲۴ء کو جوش کی سفارش کے سلسلے میں

نواب امین جنگ کو لکھا تھا۔ دوسرا نواب میر عثمان علی خاں کا فرمان ہے، جو ۳۱ر مئی ۱۹۲۴ء کو جاری ہوا اور جس میں دریافت کیا گیا ہے کہ جوش کیا چاہتے ہیں۔ تیسری درخواست نواب عمادالملک کی ہے، جس میں نواب صاحب سے جوش کی سفارش کی گئی ہے۔ یہ درخواست ۳۱ر مئی ۱۹۲۴ء کو لکھی گئی تھی۔ چوتھا فرمان ۲۵ر دسمبر ۱۹۲۴ء کو جاری ہوا، جس میں جوش کو انگلش لٹریچر کے کتب کا ترجمہ کرنے کے لیے امتحاناً دو سال کے لیے ڈھائی سو روپے ماہوار پر تقرر کی اطلاع دی گئی تھی۔ جوش نے اپنے چھوٹے بھائی رئیس احمد کو ایک خط میں لکھا ہے :۔

> "تیرا بھائی پانچ سو روپے کا ملازم ہو گیا ہے۔ دو صیغوں میں کام کرے گا۔ ڈھائی سو
> روپے ماہوار تو دارالترجمہ سے ملیں گے اور ڈھائی سو روپے تاریخ دکن کو نظم کا
> لباس پہنانے کے واسطے مقرر ہوئے ہیں۔"

اس کا مطلب ہے کچھ اس طرح کے حالات پیدا ہو گئے تھے کہ جوش کو یقین ہو گیا کہ انھیں دارالترجمہ کی ملازمت کے علاوہ تاریخ دکن لکھنے پر بھی متعین کیا جائے گا اور دونوں جگہ سے ڈھائی ڈھائی سو روپے ملیں گے۔

میر عثمان علی خاں کی سال گرہ کے موقع پر "منشور" میں جوش کی ایک نظم شائع ہوئی۔ جس کا مقطع تھا۔

> کبھی جوش کے جوش کی مدح فرما
> کبھی گل رخوں کی ثنا خوانیاں کر

اس نظم پر جوش درباری سازشوں کے شکار ہو گئے۔ نواب صاحب سے قریب رہنے والوں نے انھیں بہکا دیا کہ جوش کا روئے سخن ان کی طرف ہے۔ نواب صاحب کی طرف سے جوش کو تنبیہہ کی گئی۔ جوش نے خاصی طویل درخواست لکھ کر معافی مانگی۔ جوش کو اس شرط پر معاف کر دیا گیا کہ وہ آئندہ ایسی حرکت نہیں کریں گے۔ لیکن نہ جانے کیا ہوا کہ اخبار منشور میں شائع ہونے والی نظم کو بنیاد بنا کر نواب میر عثمان علی خاں نے جوش کو ملازمت سے نکال دیا اور حیدر آباد چھوڑ دینے کا حکم دیا۔

جوش کو مجبوراً حیدر آباد سے جانا پڑا۔ مگر انھیں حیدر آباد بہت یاد آتا تھا۔ وہ کوشش کرتے رہے انھیں حیدر آباد میں داخل ہونے کی اجازت مل جائے، لیکن نواب صاحب نے جوش کی یہ درخواستیں منظور نہیں کیں۔

اشاریہ

اشخاص

ادارے

رسائل و کتب

شہر